ISSN 0974-7346

اکتوبر ۲۰۲۵ء

جلد۲۱۲ ــــ عدد ۱۰

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زرِ تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر،منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔● خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔● معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اورنشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام:Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر:4761005500000051

آئی ایف ایس سی:PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپواکر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۲۵ء | عدد ۱۰

مجلس ادارت

پروفیسر شریف حسین قاسمی
دہلی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
علی گڑھ
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
دہلی

مرتبہ
ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۲
مقالات		
آفاقیت قرآن کی علمی و فکری توضیح: وحی قرآنی کے مفاہیم کی روشنی میں	ڈاکٹر سید مسعود احمد	۵
مردوزن کے معاشرتی تعلقات: ایک وجودیاتی مطالعہ عہد نبویؐ کی روشنی میں	عامر فہد	۲۸
عہد وسطیٰ کے ممتاز دہلوی صوفی شعراء	ڈاکٹر محمد احمد نعیمی	۳۶
باب التقریظ والانتقاد		
رسائل کے خاص نمبر	محمد عمیر الصدیق ندوی	۵۴
آثار علمیہ و تاریخیہ		
سید سلیمان ندوی کا خط	کلیم صفات اصلاحی	۶۰
تبصرۂ کتب	ع۔ص، ک۔ص۔ اصلاحی ف۔ اصلاحی	۷۱
ادبیات		
نعت مبارکہ	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۷۹
رسید کتب موصولہ		۸۰

شذرات

عادت سی ہو گئی ہے کہ جب بھی کوئی نیا غم ملتا ہے تو پرانے زخم بھی ہرے ہو جاتے ہیں۔ غمِ دوراں کے بہانے بھولے ہوئے زخموں کی یاد غالباً انسان کے عناصر ترکیبی میں شامل ہے۔ مہینوں بلکہ برسوں سے معارف کے ابتدائی صفحات گویا داستان کرب وبلا سننے اور سنانے کے لیے خاص ہو گئے ہیں۔ ہر نئے دن کے لیے دعا ہوتی ہے کہ یہ واقعی نوروز ثابت ہو۔ مگر یہ صدائے صحرا ہی نظر آتی ہے۔ بلائیں، وبائیں، حادثات اور سانحات تو کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی مشیت کا نتیجہ ہیں۔ مگر ظلم و تشدد اور تکبر وانانیت جیسی بدترین بیماریوں میں مبتلا انسان نما وحشیوں کے رقص شر وشرر کے ذریعہ وجود انسانی کو چھلنی کرنے والی جراحتوں کا حساب واحتساب کیسے کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ گئے وقت ہی کو آواز دی جائے۔ (فاقصص القصص) داستانیں اسی لیے ہیں کہ ماضی، حال بنتا رہے اور حال کو ماضی بننے سے روکتا بھی رہے۔ غزہ ہے تو اس کے حال کو صلیبی جنگوں والے ماضی کو یاد کرنا ہی چاہیے۔ غزہ تو اب فرعون و قوم موسیٰ والے ظالم و مظلوم، اور قوت و اقتدار و سرمایہ کے سامنے ضعیفی، محکومی اور افلاس والی حقیقتوں کا استعارہ اور اعلامیہ ہے۔ فرعونیت مقامی ہو کر بھی اپنی ابلیسیت کی وجہ سے حدود ثغور کی پرواہ نہیں کرتی اور حق تو یہ ہے کہ یہ مذہب وملت کی پہچان سے بھی سروکار نہیں رکھتی۔ فرعون کے مذہب کو کوئی کیا پوچھے۔ جب کہ وہ خود ہی کو مذہبی شناخت سے بالاتر سمجھ کر 'رب اعلیٰ' ہونے کا اعلان کرنے میں باک محسوس نہیں کرتا۔ ماضی میں ظلم اور جبر کی جتنی داستانیں لکھی گئیں وہ جھوٹ اور تکبر کی سیاہی سے لکھی گئیں۔ ملک عزیز میں بھی شب وروز کی کروٹوں میں ایسے قصوں کی کمی نہیں۔ جھوٹ، مکر، فریب، الزام تراشی اور پھر اقتدار اور سرمایہ کی راہ میں رکاوٹ بننے والی بستیوں اور ہستیوں کی شکست وانہدام کے مظاہر اب اتنے عام ہیں کہ عبارت کی ضرورت ہی نہیں، اشارت ہی کافی ہے۔

***

اصل سوال تو اوپر ہی رہ گیا کہ ماضی سے ہمت وحوصلہ کی کرنیں لے کر حال کی تاریکیوں کو دور کرنے کا وقت کیا اب بھی نہیں آیا؟ اس کے لیے ملک عزیز میں نشانۂ ستم، قوم کو بہت دور جانے

کی بھی حاجت نہیں۔ ملک کی آزادی سے پہلے گردش روزگار نے آنکھوں سے قریب اور دور کیسے کیسے منظر دکھائے۔ وہ یاد تو رکھے جاسکتے ہیں لیکن ان کو یاد کرنے میں سردست بھلائی نہیں۔ بات تو آزادی کے بعد جمہوری، نامذہبی اور سماجی و شہری برابری کے حقوق واختیارات کی نئی فضا کی ہے۔ آزادی کے بعد بہ مشکل ایک دہائی کی مدت دراز ہوئی تھی کہ تمام تحفظات کی موجودگی میں آئین کی ردائے حرمت و تقدس کو داغدار کرنے کی کوششوں کا انجام بدسامنے آنے لگا۔ اور اس کی پہلی بدترین صورت ۶۴-۱۹۶۳ء میں کلکتہ، رانچی، جمشید پور اور راوڑ کیلا کے فسادات کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ مستند رپورٹوں کے لحاظ سے صرف جمشید پور اور راوڑ کیلا میں تین ہزار سے زیادہ مسلمان قتل کیے گئے۔ پورا ملک ان فسادات میں جان و مال کے عظیم نقصان سے سخت متاثر ہوا۔ ان علاقوں کی صنعتی اور تجارتی زندگی بے جان سی ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک کا سانحہ اور المیہ، اقتدار سے بے دخل ہونے والی غیر ملکی حکومت کے نامۂ اعمال میں شامل کیا گیا لیکن یہ فسادات، ملک کی سمت سفر کو کسی اور بربادی کی منزل کی جانب لے جانے والے منصوبے کی پہلی عبارت بنتے نظر آرہے تھے۔ خاص طور پر غیر ملکی قبضے کے خلاف ایک صدی سے زیادہ سرفروشی کی روایت قائم کرنے والی قوم کو احساس بھی نہیں تھا کہ آزادیٔ ملک کے بعد اب ان کے لیے غلامی کی زنجیروں کو تیار کیے جانے کا عمل اس شکل میں ظاہر ہو گا۔ حد یہ ہے کہ جس دھرم کا نام لے کر فسادات کی یہ آگ بھڑکائی گئی اسی کے ایک بڑے صاحب فکر واثر راہ نما نے پارلیمنٹ کے اراکین کے نام خط میں لکھا کہ ”مظالم میں کوئی حد باقی نہیں رہی، ہر نفرت انگیز اور شرمناک حرکت کی گئی، بے رحمی اور گراوٹ کا اندازہ کرنا بھی محال ہے“۔ یہ بھی لکھا کہ ”ثابت ہو گیا کہ تعلیم، درندگی اور مجرمانہ حرکتوں کی طرف میلان کا تدارک نہیں۔ حکومت کی انتظامیہ واقعی ناکافی اور نااہل ثابت ہوئی“۔ ایک محب وطن غیر مسلم شہری کے جب یہ جذبات تھے تو ظاہر ہے آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونے والے قومی قائدین پر کیا کچھ گزری ہو گی۔ اس وقت جو بظاہر فسطائی اور تخریبی قوتوں کے عروج کیا، ظہور سے بھی پاک وقت تھا، اس زمانے میں ایسے خیالات ذہن پر چھانے لگے کہ اس نفرت اور پاگل پن کا اگر سدباب نہیں کیا گیا تو مسلمانوں کے لیے تعمیری و تعلیمی کام کی گنجائش کیا خود ان کا ملّی وجود ہی مشکوک ہو کر رہ جائے گا اور ایسا ہوا تو پھر کہیں اور زندگی کی سانسوں کے لیے فضائے غیر میں سرگرداں ہونے کی نوبت نہ آجائے۔

***

اسی احساس نے منقسم ہی نہیں غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار مسلمانوں کے تمام طبقوں، مسلکوں، دانشوروں، سیاست دانوں اور مختلف زبانوں اور علاقوں کے نمائندہ افراد و شخصیات کو آمادہ و مجبور کیا کہ موجود و معہود فتنوں کے سدباب کے لیے اختلاف فکر و نظر کے باوجود ایک متحدہ لائحۂ عمل کے لیے ایک جگہ، ایک ساتھ اور ایک مقصد کے لیے جمع ہوا جائے۔ برصغیر میں جہاں مسلم اقلیت کی جماعتوں کی قلت کا کبھی شکوہ نہیں رہا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں سو سے زیادہ جماعتیں تھیں جو مذہب، سیاست اور شخصیت کے سہارے صرف زندہ ہی نہیں تھیں، اپنے ہی اندرون سے اور جماعتوں کے ظہور کے تخلیقی عمل پر کاربند بھی تھیں اور بقول صاحب معارف، اتحاد کے نام پر انتشار کی نئی شکل سے متعارف بھی کراتی تھیں۔ ایسے تعددی مسلم معاشرہ میں ایک نصب العین اور ایک لائحۂ عمل کے لیے سب کا متحد الخیال ہونا، یقیناً ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ تھا۔ ۱۹۶۴ء میں ندوۃ العلماء کے ایک نو تعمیر ہال میں ملت کی تعمیر نو کے لیے قومی نمائندوں کا اس طرح جمع ہونا ایک ہی فلک پر سارے ستاروں اور سیاروں کے ناقابل یقین اجتماع سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور اس سے کہیں زیادہ مسرت انگیز واقعہ تھا۔ ملک کے سیاسی اور اس سے زیادہ ملت کے اخلاقی خلا کو پر کرنا اس اشتراک عمل کی روح قرار دیا گیا۔ ملک و ملت کی تمام آرزوئیں اس سے وابستہ ہو گئیں۔ یہ تمنائیں اور اس تنظیم کی تشکیل اور اس کے مابعد اثرات اب تاریخ کا حصہ ہیں اور جس میں قومی زوال کی بے شمار مثالیں مؤرخوں اور تجزیہ نگاروں کے قلم اور کاغذ کی خوراک ہیں۔ لیکن یہ حقیقت بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ اس اولین کوشش اور امکانی لحاظ سے ملک کی تقدیر بدل دینے کا جوہر رکھنے والی تنظیم کی ناقدری اور بے اعتنائی کا خمیازہ ہی نہیں ننگ و نام لٹ جانے کی سزا سے قوم کو دوچار ہونا پڑا اور جس کا نقطۂ عروج موجودہ سیاسی منظر نامہ ہے۔ اور اگر دردمندوں اور فکرمندوں کا یہ احساس زیاں اب بھی کسی حد تک زندہ ہے تو ماضی کی آواز پر لبیک کہنے کا شاید سب سے مناسب وقت یہی ہے کہ مسلم مجلس مشاورت کی روح کو بے تابانہ آواز دی جائے۔ ساٹھ سال کی نیند بہت ہوتی ہے۔ شکر ہے کہ جاگنے اور جگانے کا پر مشقت عمل بعض کتابوں اور دستاویزوں کی اشاعت سے شروع ہو گیا ہے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ۔

***

مقالات

آفاقیت قرآن کی علمی و فکری توضیح :وحی قرآنی کے مفاہیم کی روشنی میں

ڈاکٹر سید مسعود احمد

ڈائریکٹر، آفاقیت قرآن پروجیکٹ، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

masoodahmad1952@gmail.com

قرآن حکیم اللہ رب العزت کا نازل کردہ آخری صحیفۂ ہدایت ہے جو تاقیام قیامت تمام جن وانس کے مسائل حیات کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔اس کی عالم گیریت وہمہ گیریت کے لیے اردوزبان میں ایک جامع اصطلاح بیسویں صدی کے نصف آخر میں منظر عام پر آئی جو "آفاقیت قرآن" سے موسوم ہے۔ عربی لٹریچر میں اس کو عالمیۃ القرآن کا نام دیا گیا اور انگریزی میں یہ (Universality of the Quran) سے معروف ہے۔اس اصطلاح کو اسلامی حلقوں میں ابھی خاطر خواہ رسوخ عام بھی حاصل نہیں ہوا ہے کہ اس اصطلاح کے نام سے قرآن مجید کی عالمگیریت وہمہ گیریت اور ہمہ جہت اعجاز وعظمت پر مستشرقین ومستغربین نے تشکیک وتعریض کا نیا محاذ کھول دیا ہے[۱]،[۲]۔

لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ اس یلغار کا باقاعدہ جواب دیا جائے۔بتوفیق ایزدی

---

(۱) فرہاد شفتی، http://exploring.islam بلاگ ۱۰/۱۲/۲۰۱۹ The True Meaning of Universality of Qur'an (4th Edition)

(۲) محمد خلیل جیبجک، عالمیۃ القرآن، ۲۰۰۲، اس کتاب کو http:/ebook.Univeyes.com سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس حقیر نے آفاقیت قرآن پروجیکٹ[۳] کا علی گڑھ میں آغاز کر کے آفاقیت قرآن کی اصطلاح کو نئے سرے سے اسلامی اور اردو ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کی کوشش کی[۴]، اس نئی اصطلاح کی جامع تعریف وضع کی[۵] اور تفسیری حلقوں میں آفاقیت قرآن کی بنیاد پر تفسیری کاوشوں کی ترتیب و تدوین کی طرف توجہ دلائی[۶]۔ بحمد اللہ امت مسلمہ کے علمی حلقوں میں اب اس طرف توجہ محسوس ہونے لگی ہے[۷]۔ البتہ اس وقت متعدد محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جس میں آفاقیت قرآن کے تعلق سے بنیادی شکوک واعتراضات کے جوابات دینا[۸] اور آفاقیتِ قرآن کی اطمینان بخش توضیح وتشریح کے ساتھ آفاقیتِ قرآن پر مبنی تفسیر جدید کا ایک جامع خاکہ پیش کرنا شامل ہے[۹]۔ یہ مضمون آفاقیتِ قرآن کی تشریحِ جدید کی ایک کڑی ہے۔

---

(۳) آفاقیتِ قرآن پروجیکٹ، ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۲۱ء سے جاری ہوا۔

(۴) سید مسعود احمد، تفاسیر قرآن میں آفاقی جہات کی شمولیت، عصر حاضر کا تقاضا، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۳۵، جنوری -جون ۲۰۲۰ء، ص ۱۳- ۴۲

(۵) سید مسعود احمد، وسیف اللہ اصغر اصلاحی، قرآن کا تصور آفاقیت: لغوی وفکری مباحث کے آئینے میں، معارف، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، مارچ ۲۰۲۵ء، ص ۵۔۱۱
آفاقیت قرآن کی تعریف کے لیے مزید دیکھیں، سید مسعود احمد، آفاقیت قرآن: اہم مباحث، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، جلد ۴۴، جنوری -مارچ ۲۰۲۵ء، ص ۳۱-۶۰

(۶) سید مسعود احمد، تفاسیر قرآن میں آفاقی جہات کی شمولیت، عصر حاضر کا تقاضا، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۳۵، جنوری -جون ۲۰۲۰ء، ص ۱۳-۴۲۔ مزید دیکھیں: سید مسعود احمد، وظفر دارک قاسمی، آفاقیتِ قرآن ،چند متداول تفاسیر پر ایک نظر، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۳۵، جولائی -دسمبر ۲۰۲۴ء، جلد ۵۸، ص ۱۴- ۳۳

(۷) سید مسعود احمد، وسیف اللہ اصلاحی، متداول تفاسیر میں سورہ الفاتحہ کے حوالے سے آفاقیت کی تلاش، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جنوری -جون ۲۰۲۵ء، ص ۴۷ – ۶۳۔ مزید دیکھیں : سید مسعود احمد ،و ظفر دارک قاسمی، امت وسط اور خیر امت کا آفاقی مفہوم: عصر حاضر کی متنوع تفاسیر کی روشنی میں، منتظر اشاعت ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ۔

(۸) سید مسعود احمد، آفاقیت قرآن: اصول و مبادی اور اعتراضات و جوابات، داخل اشاعت۔

(۹) سید مسعود احمد، تفاسیر قرآن میں آفاقی جہات کی شمولیت، عصر حاضر کا تقاضا، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۳۵، جنوری -جون ۲۰۲۰ء، ص ۱۳ ـ ۴۲

وحی اور ہدایت الٰہی: تمام مخلوقاتِ عالم بشمولِ بنی نوع آدم ہر لمحہ خدائی ہدایت کے محتاج ہیں اور رب کائنات ہمہ آن ان کی طلب و حاجت کے بقدر ہدایت سے نوازتا رہتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے کہ "الَّذِیٓ أَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ ہَدٰی" (طٰہٰ: ۵۰) (اس نے ہر چیز کواس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس کی رہنمائی کی)۔ اورمزید ارشادربانی ہے: "الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَہَدٰی" (الاعلیٰ: ۲ - ۳) (جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پلک سنوارے ... اور جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی)۔ بالفاظ دیگر پروردگار عالم اپنی ربوبیت کے اس فیضان کو وحی الٰہی کے ذریعے بروئے کار لاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنی پروردگاری کا بڑا مظاہرہ ان لطیف اشاروں کے ذریعے جن کو اسلامی اصطلاح میں "وحی" کہا جاتا ہے، تمام مخلوقات عالم پر ہر لمحہ جبلی یا شعوری ہدایت کے فیضان کی شکل میں کرتا رہتا ہے اور لاریب انسان بحیثیتِ اعلیٰ مخلوق، شعوری اور جبلی دونوں سطحوں پر ہر لمحہ خصوصی ہدایت کا محتاج ہے۔ اس عالم ہست و بود میں وحی الٰہی ہی عقل و وجدان، فطرت و جبلت اور علم و حکمت کا منبع رہی ہے۔ وحی الٰہی سے ہماری مراد وہ لطیف خدائی اشارے (Divine Signals)[10] ہیں جو ہادی برحق شہد کی مکھی تک کو اس کی احتیاج کے مطابق بتمام خوبی و کمال اور بر وقت و بر محل پہنچاتا رہتا ہے نیز تاریخ کے ایک اہم واقعاتی موڑ پر حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو بھی خصوصی آگہی بطور وحی کی گئی کہ اپنے بیٹے کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دیں۔ مزید برآں رب ذوالجلال والاکرام نے ہر انسان کو اچھے اور برے عمل کی تمیز کا الہام کیا[11] جو وحی الٰہی کی ادنیٰ شکل ہے، جبکہ وحی الٰہی کی اعلیٰ ترین شکل یہ ہے کہ پیغام الٰہی کی اعلیٰ درجاتی ترسیل کے لیے اپنے منتخب کردہ مخصوص بندوں کے قلوب کو اخذِ وحی الٰہی کا بےخطا ملکہ عنایت فرمایا تاکہ وہ جملہ زمانی و مکانی مسائلِ حیات میں مرضیات خداوندی سے اپنی امت

---

(۱۰) أصل الوحی الإشارة السریعة، ولتضمن السرعة قیل: أمرٌ وحيٌ، وذلک یکون بالکلام علی سبیل الرمز والتعریض، وقد یکون بصوت مجرد عن الترکیب وبإشارة ببعض الجوارح، وبالکتابة...: راغب اصفہانی، ابوالقاسم حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دارالمعرفہ، بیروت، بدون تاریخ، ص۵۱۵۔

(۱۱) الشمس :۸؛ الدھر:۳

دعوت و اجابت کو آگاہ کر سکیں۔[۱۲]

قرآن کریم اور وحی الٰہی: قرآن کریم تمام کائنات کے لیے پروردگارِ حقیقی کی رحمت اوراس کے فضل وکرم کا بہترین مظہر ہے اور احسنِ تقویم پر تخلیق شدہ انسان خصوصاً اس مہتم بالشان ذریعۂ ہدایت کا سب سے زیادہ محتاج ہے۔ آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل جب دنیائے انسانیت شعور کی اس منزل کو پہنچ چکی تھی کہ وہ ایک جامع و کامل اور آفاقی ہدایت الٰہی کی حامل بن سکے اور ترسیل ہدایت کے مادّی ذرائع اتنے ترقی یافتہ اور مستحکم ہو چکے تھے کہ معلوم دنیا تک پیغام الٰہی پہنچایا جاسکے اور دوسری طرف اسی دنیائے انسانیت کے حالات اتنے ناگفتہ بہ تھے کہ ظلم و بربریت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھٹکتی اور سسکتی انسانیت کے بے شمار مسائل کے پائدار حل کا حصول ہر قلب سلیم کی متفقہ آواز بن گیا تھااور اس وقت مہذب دنیا کی دو بڑی سیاسی طاقتیں یعنی روم وفارس آپس میں دست بگریباں تھیں اور ٹھیک اسی زمانے میں شہر مکہ مکرمہ میں جہاں توحیدِ خداوندی کی عظیم الشان علامتِ حق یعنی بیت اللہ پر یمن کے حکمراں ابرہہ کے حملے میں اس کو ہلاکت اور باطل کو شکست فاش ہی نہیں بلکہ ذلت و نکبت سے دوچار ہونا پڑا تھا اور حق کی فتحِ کامل کا معجزانہ ظہور ہوا تھا۔ ابھی اس واقعے کو نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ اسی شہر کی امی مگر صادق و امین ذات گرامی موسوم بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہدایتِ الٰہی کا جامع، تفصیلی اور مکمل متن تیئس سال کے عرصہ میں جستہ جستہ نازل ہوا اور اس طرح ہمہ گیر ظلم کی طویل رات میں بھٹکتی، سسکتی انسانیت کو حقیقی امن و چین اور راحت کا سانس لینے کا موقع ملا اور اس مینارۂ نور ”القرآن المجید“[۱۳] کے ذریعے شاہ راہِ مستقیم اور منزلِ مقصود سے بنی نوع آدم کو آشنا کرایا گیا جس کا نورازلی و ابدی اور ہدایت آفاقی ہے۔

جیسا کہ تمہیدی کلمات میں عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کا فیضانِ نزول تمام مخلوقات عالم پر ہمہ آن اور ہمہ گیر جاری سنت ومشیت الٰہی ہے یعنی اللہ عز و جل اپنی

---

(۱۲) آل عمران ؛۳۳؛الحج:۷۵؛ص :۴۷

(۱۳) ق:۱

جملہ مخلوقات پر جو عموی و خصوصی امر کرتا ہے وہ اپنی وحی کے ذریعے کرتا ہے۔ یہ امور دو قسم کے ہوسکتے ہیں: تکوینی یا تشریعی۔ تشریعی امور میں اپنے بندوں کو اختیار دے کر رب العالمین اس مطلوبہ عمل کی انجام دہی کے بعد اپنی رضا کی سند سے نوازتا ہے جبکہ تکوینی امور میں کلمۂ "کُن" کے ذریعے اپنے اذن و مشیت کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ اس کلمۂ "کُن" میں یک گونہ جبر کا پہلو ہے، مزید برآں اس کلمۂ "کُن" کا مطلوبہ عمل درآمد ہر قسم کے مادّی لواحق سے منزّہ ہے۔ بالفاظ دیگر کلمۂ "کُن" اور اس کا جواب "فیکون" بھی حقیقی طور پر تو، اُلوہی شان رکھتے ہیں مگر یہ حکمتِ عظیمہ کے تحت زمان و مکان کی حدود وقیود میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

وحی الٰہی کی اہم اقسام: وحی الٰہی کی دو اہم قسمیں: وحی تکوینی اور وحی تشریعی ہیں۔ وحیِ تشریعی مکلف مخلوقات کو کی جاتی ہے اوراس کی اعلیٰ ترین قسم، انبیاء کرامؑ کو کی جانے والی وحی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالی اپنی مکلف مخلوق کو مخاطب کر کے ان پر اپنی پسند و ناپسند سے آگاہ کرتا ہے۔ اس تشریعی وحی کی اعلیٰ وارفع شکل کلام الٰہی کی وحیِ جلی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنا کلام رسولِ وقت کے قلب پر القا کرتا ہے۔ اور کلام الٰہی کے نزول کی بھی دو شکلیں ہیں: ایک شکلِ نزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے مفہوم کو نبی وقت پر القا کرے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام پر دونوں اقسام کی وحیوں کا فیضانِ نزول قرآن مجید سے ثابت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ موسیٰؑ علیہ السلام سے کوہِ طور پر ہم کلام ہوا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفہومِ کلام کے بجائے عین کلمات وحی کیے جارہے تھے، البتہ اس کے علاوہ عام طور پر ترسیل ہدایات کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر جس کلام الٰہی کا نزول ہوتا تھا اس میں تعلیمات و ہدایات بے شک واضح اور صاف تھیں خواہ ان کے مفاہیم ہی قلب موسیٰ پر القا کیے گئے ہوں۔ اور ایک تیسری شکل بھی ترسیل ہدایت کی زمانۂ بعثت موسیٰ علیہ السلام میں منصۂ شہود پر آئی، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام بشکل احکامِ عشرہ لوحِ حجر پر نقش وکندہ کر کے مرحمت فرمایا خواہ بواسطہ رسول یا بلاواسطۂ رسول۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کسبی علم کے واسطے سے اس کلامِ الٰہی کو پڑھا اور اپنے مخاطبین تک اس ہدایت کو بشکلِ احکاماتِ عشرہ پہنچایا۔

نزول و ترسیل وحی کی متنوع شکلیں قرآن و سنت کی روشنی میں:

۱-آیت الشوریٰ: ۵۱ کی تشریح و تفسیر کے تحت پہلے کلامِ ربانی ملاحظہ ہو[۱۴]:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَآءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْم (الشوریٰ: ۵۱)

ترجمہ شیخ الہندمحمودحسنؒ:" اورکسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچادے اس کے حکم سے جو وہ چاہے، تحقیق وہ سب سے اوپر ہے حکمتوں والا ہے"۔

تفسیر شبیرعثمانیؒ:" کوئی بشر اپنی عنصری ساخت اورموجودہ قویٰ کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ خدا وند قدوس اس دنیا میں سامنے ہوکرمشافہۃً کلام فرمائے اوروہ تحمل کرسکے۔اس لیےکسی بشر سے اس کے ہم کلام ہونے کی تین صورتیں ہیں (الف) بلا واسطہ پردے کے پیچھے سے کلام فرمائے یعنی نبیؐ (وقت) کی قوت سامعہ استماع کلام سے لذت اندوز ہومگر اس حالت میں آنکھیں دولت دیدار سے متمتع نہ ہوسکیں۔جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور(پر) اورخاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ سلم کو لیلۃ الاسراء میں پیش آیا۔(ب)بواسطۂ فرشتہ کےحق تعالیٰ کلام فرمائے مگرفرشتہ متجسد ہوکرسامنے نہ آئے بلکہ براہِ راست نبی کے قلب پرنزول کرے اور قلب ہی سے ادراک فرشتے کا اور صورت کا ہوتا ہو(جس میں) حو اس ظاہرہ کو چنداں دخل نہ رہے۔میرے خیال میں یہ صورت ہےجس کو عائشہ صدیقہؓ کی حدیث میں"یَا تِیْنِی فِی مِثْلِ [صلصلة] الْجَرْسِ"سےتعبیرفرمایا ہےاورصحیح بخاری کی کتاب بدءالوحی(حدیث نمبر۲) وحی کی اس صورت میں بھی اِتْیَانِ مَلَکْ کی تصریح موجود ہے۔اس کوحدیث میں"وَھُوَ اَشَدُّہُ عَلَیَّ"فرمایا اورشاید وحیِ قرآنی بکثرت اس صورت میں آتی ہو جب کہ"نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ"اور"فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہ"میں لفظ"قَلْبِکَ"سے اشارہ ہوتا ہےاورچونکہ یہ معاملہ بالکل پوشیدہ طور پراندرہی اندرہوتاتھایعنی پیغمبر کے وجود سے باہر کوئی علیحدہ ہستی نظرنہیں آتی تھی،اور نہ

---

[۱۴] شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، مکتبہ جاوید دیوبند،۲۰۰۹،ج دوم،ص۵۱۹- ۵۲۰۔

اس طرح کلام ہوتا تھا جیسے ایک آدمی دوسرے سے بات کرتا ہو کہ پاس بیٹھنے والے سامعین بھی سمجھ لیں، اس لیے اس قسم کو خصوصیت کے ساتھ آیت ہذا میں تو"وَ حیاً" سے تعبیر کیا کیونکہ لغت میں وحی کا لفظ اخفاء اور اشارۂ سِرّیہ پر دلالت کرتا ہے (ج) تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ متجسد ہو کر نبی کے سامنے آجائے اور اس طرح خدا کا کلام وپیام پہنچا دے جیسے ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہے، چنانچہ حضرت جبرئیل ایک دومرتبہ اپنی اصل صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اکثر مرتبہ حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں آتے تھے اور کبھی کسی غیر معروف آدمی کی شکل میں بھی تشریف لائے ہیں۔ اس وقت آنکھیں فرشتہ کو دیکھتیں اور کان اُس کی آواز سنتے تھے اور پاس بیٹھنے والے بھی بعض اوقات گفتگو سنتے اور سمجھتے تھے۔ عائشہؓ صدیقہ کی حدیث میں جو دو قسمیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے یہ دوسری صورت ہے اور میرے خیال سے اس کو آیت ھذا میں "اَوْیُرْسِلَ رَسُولاً فَیُوحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآئُ" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ باقی حجاب والی صورت چونکہ بالکل نادر بلکہ اندر تھی اس لیے عائشہؓ کی حدیث میں اس سے تعرض نہیں کیا گیا ہے"۔

تفسیر مفتی شفیع عثمانی[۱۵] (آیات ۵۱- ۵۲): "اور کسی بشر کی (بحالت موجودہ) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے، مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے کہ (قلب میں کوئی اچھی بات ڈال دے) یا حجاب کے باہر سے (کچھ کلام سنادے، جیسے موسیٰ علیہ السلام) نے سنا تھا) یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے، پہنچا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بڑا عالیشان ہے بڑی حکمت والا (بھی) ہے اسی طرح ہم نے آپ ﷺ کے پاس بھی وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے"۔

حفاظتِ وحی میں قرآن کے امتیازات: سورہ فصلت آیات ۴۱-۴۲ کی تفسیر مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن[۱۶] میں یوں کرتے ہیں: "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِالذِّکْرِ لَمَّا جَآءَ ھُمْ

---

[۱۵] محمد شفیع عثمانی، معارف القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ج ہفتم، ص ۱۲-۱۳/۷

[۱۶] امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۹۷، ج ہفتم، ص ۱۱۰-۱۱۴

وَإِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ. لَّا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِن م بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ"(فصلت:۴۱- ۴۲)

ترجمہ:"جن لوگوں نے اللہ کی یاددہانی کاانکارکیاجب کہ وہ ان کے پاس آگئی (ان کی شامت آئی ہوئی ہے) بیشک یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے۔اس میں باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوسکتاہےاورنہ اس کے پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم وحمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری گئی ہے"۔

تفسیر تدبر قرآن: بالذکر میں ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔ "إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَ هُمْ"کے الفاظ خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں۔اس سے ان کے جرم کی غایت درجہ سنگینی کا اظہار مقصود ہے۔ ایک چیز ایک شخص نے دیکھی نہ ہو اور اس کے حسن وقبح کے پرکھنے کااسکوموقع نہ ملا ہو،اوروہ اس کی نا قدری کرےتو اس کو ایک حدتک معذور قرار دیاجاسکتاہےلیکن جس نے قرآن کودیکھ لیا، اس کے اعجاز کوپرکھ لیااوراس کے دلائل کی قوت کواچھی طرح آزمالیا،وہ اگرقرآن کا انکار کرتاہےتووہ سورج کی تابانی کااس وقت انکارکررہاہےجب وہ اس کے سر پرچمک رہا ہے۔

قرآن کی بعض صفات کا حوالہ:"وَإِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ"میں دو پہلو ہیں: ایک تہدیدووعید کا، دوسراقرآن کی پاکیزگی وطہارت کا۔ تہدیدووعید کے پہلو سے یہ سابق مضمون سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ آگے آنے والی آیت کی تمہید ہے۔عزیز کے ایک معنی غالب ومقتدر کے ہیں۔اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے یہ تہدید کے مضمون کی دلیل ہے کہ جو لوگ قرآن کا انکار کر رہے ہیں وہ اس حقیقت کو نظرانداز نہ کریں کہ یہ قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ اس کا بھیجنے والا بھی عزیز یعنی غالب ومقتدر ہے اور یہ کتاب خودبھی عزیز ہے، اسی وجہ سے اس کی حیثیت ایک فرمان واجب الاذعان کی ہے۔جو لوگ اس کا انکار کریں گے وہ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیں کہ یہ کتاب ان کا فیصلہ کر کے رہے گی۔یہاں اس سنت الٰہی کو ذہن میں رکھیے جو رسولوں سے متعلق جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔

عزیز کے دوسرے معنی مَنِيْعٌ کے ہیں۔ منیع اس چیز کو کہتے ہیں جو دسترس سے بالاتر

ہو۔اس کی وضاحت آگے والی آیت میں آرہی ہے۔یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ شیاطینِ جن و انس خواہ کتنا ہی زور لگا لیں لیکن وہ اس میں کوئی گڑبڑ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔باطل نہ اس کے آگے سے اس میں گھس سکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کی در اندازی سے اس کو ہر جانب سے محفوظ بنایا ہے۔یہ گویا جواب ہوا مخالفین کی اس سعی نامراد کا جس کا ذکراوپرہوچکا ہے کہ"وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ"(اورکافرکہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گھپلا پیدا کردو تا کہ تم غالب رہو):"لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ": یہ قرآن کی عظمت اوراس کے شرف کاایک جامع بیان ہے جس کے دوپہلو خاص طورپراہمیت رکھنے والے ہیں۔

ایک یہ کہ قرآن اپنے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے بالکل محفوظ ہے۔اس کو اتارنے والا اللہ تعالیٰ ہے،اس کولانے والے جبرئیل امین ہیں،اس کے حامل محمدرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کو نقل وقبول کرنے والے اس خلق کے پاکیزہ ترین اخیار وصالحین ہیں۔گویا ابتدا سے لے کر انتہا تک ایں خانہ تمام آفتاب است - اس میں کہیں بھی شیطان کی دراندازی کے لیے کوئی روزن نہیں ہے، نہ اس کے آغاز کی طرف سے نہ اس کی انتہا کی طرف سے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا،جیساکہ"وَإِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" (الحجر :۹) کے الفاظ سے واضح ہے،خوداہتمام فرمایا،اوریہ قرآن کاوہ امتیازہےجو اس سے پہلے نازل ہونے والے صحیفوں کوحاصل نہیں ہوا۔تورات وانجیل وغیرہ کی حفاظت کی ذمے داری اس کے حاملین پرڈالی گئی تھی جواس کا حق ادانہ کرسکے،جس کایہ نتیجہ ہواکہ یہ صحیفے بالکل محرف ہوگئے،ان کے اندرحق وباطل کاامتیازناممکن ہوگیا۔لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نےخودلیااوراس کوقیامت تک کے لیے ہرقسم کی آمیزش سے بالکل محفوظ کردیا۔ اس حفاظت کے کئی پہلوہیں۔

قرآن کی حفاظت کےبعض پہلو: ایک یہ کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں اللہ تعالیٰ نے اس امرکاخاص اہتمام فرمایاکہ قرآن کی وحی میں شیاطین کوئی مداخلت نہ کرسکیں۔یوں

تو اس نظام کائنات میں یہ مستقل اہتمام ہے کہ شیاطین ملأاعلیٰ کی باتیں نہ سن سکیں، لیکن سورۂ جنّ کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں یہ اہتمام خاص طور پر تھا کہ شیاطین وحی الٰہی میں کوئی مداخلت نہ کر پائیں تاکہ ان کو قرآن میں اس کے آگے سے (مِن بَيْنِ يَدَيْهِ) کچھ گھٹانے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے اپنے جس فرشتہ کو منتخب کیااس کی صفت قرآن میںذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ. مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍاور عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ وارد ہوئی ہے۔یعنی وہ فرشتہ ایسازورآور ہے کہ ارواح خبیثہ اس کو مغلوب نہیں کرسکتیں۔ وہ تمام فرشتوں کا سردار ہے،وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتا۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت اس کے حوالے کی جاتی ہے وہ اس کو بالکل ٹھیک ادا کرتا ہے۔مجال نہیں ہے کہ اس میں زیروزبر کا بھی فرق واقع ہو سکے۔وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت ہی مقرب ہے جواس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر ہے...... ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی اسی لیے فرمایا گیا کہ قرآن میں اس کے منبع کی طرف سے کسی باطل کے گھسنے کا امکان باقی نہ رہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو اٹھانے کے لیے جس بشر کو منتخب فرمایا اول تو وہ ہر پہلو سے خود خیرِ خلائق تھا،ثانیاً قرآن کو یادرکھنے اور اس کی حفاظت وترتیب کی ذمے داری اللہ تعالیٰ نے تنہااس کے اوپر نہیں ڈالی بلکہ یہ ذمے داری اپنے اوپرلی، چنانچہ سورہ قیامہ میں فرمایا:"لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ،إِنَّ عَلَيْنَاجَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ،ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ.(القیامۃ:۱۶ - ۱۹) (اور تم اس قرآن کو حفظ کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیزنہ چلاؤ، ہمارے اوپرہے اس کے جمع کرنے اوراس کے سنانے کی ذمے داری،تو جب ہم سناچکیں تواس سنانے کی پیروی کرو،پھرہمارے ذمے ہے اس کی وضاحت کرنا)۔ روایات سے ثابت ہے کہ جتنا قرآن نازل ہوچکاہوتااس کو نبی ﷺاورآپ کے مقرب صحابہؓ یاد بھی رکھتے اورہر رمضان میں حضرت جبرئیل کے ساتھ آنحضرت ﷺ اس کا مذاکرہ بھی فرماتے رہتے تاکہ کسی سہوونسیان کااندیشہ نہ رہے اوراسی ترتیب اوراسی قرأت کے مطابق پوراقرآن ضبطِ تحریر میں لایاگیااوربعدمیں

خلفاء راشدین نے اس کی نقلیں مملکت کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔ یہ اہتمام پچھلے صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو نہیں ہے کہ اس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔

چوتھا یہ کہ قرآن اپنی فصاحتِ الفاظ اور بلاغتِ معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے جس کی وجہ سے کسی غیر کا کلام اس کے ساتھ پیوند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک نبی ﷺ کا اپنا کلام بھی باوجود یکہ آپ اس قرآن کے لانے والے اور افصح العرب والعجم ہیں، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی غیر کا کلام اس کے ساتھ مخلوط ہو سکے۔ چنانچہ جن مدعیوں نے قرآن کا جواب پیش کرنے کی جسارت کی ان کی مزخرفات کے نمونے ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ ان کو قرآن کے مقابل میں رکھ کر موازنہ کر لیجیے۔ دونوں میں گُہر اور پشنیز کا فرق نظر آئے گا۔ اس طرح گویا پیچھے سے بھی (وَمِنْ خَلْفِہٖ) قرآن میں دراندازی کی راہ مسدود کر دی گئی۔

پانچواں یہ کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی زبان کی حفاظت کا بھی قیامت تک کے لیے وعدہ فرمالیا۔ دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو ان کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے، لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ اس وجہ سے ترجموں اور تفسیروں کی راہ سے اس میں کسی باطل کے گھسنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر اس میں کسی باطل کو گھسانے کی کوشش کی جائے گی تو اہل علم اصل پر پرکھ کر اس کو چھانٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔

یہاں ہم نے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کے پہلو بعض اور بھی ہیں لیکن یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ ان چند باتوں سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کی یہ شان کیوں ہے کہ باطل نہ اس کے آگے سے اس میں راہ پا سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔

درشتی و نرمی بہم در بر است: ’’تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ‘‘ میں لفظ تنزیل کی وضاحت ہم کر چکے ہیں

کہ اس کے اندراہتمام اور تدریج کامفہوم پایا جاتا ہے۔اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ خدائے عزیزوحمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری ہوئی کتاب ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے یہاں دوصفتوں حکیم اور حمید کاحوالہ ہے۔"حکیم"یعنی جس کی ہربات اور جس کے ہرکام میں حکمت ہے۔چنانچہ اُس نے یہ حکیمانہ کلام نہایت اہتمام کے ساتھ اتا راہے۔"حمید"یعنی جو سزاوارِ حمد، ستودہ صفات اور تمام سزاوارحمد کاموں کا منبع وسرچشمہ ہے۔چنانچہ اس نے اپنی اس عظیم نعمت سے اپنی خلق کو محض اپنے جودوکرم سے نوازا۔اوپروالی آیت میں صفت"عزیز" کاحوالہ ہےجس میں تنبیہ وتہدید کاپہلو ہے۔اس آیت میں حکیم وحمید کاحوالہ اپنے اندرترغیب کاپہلورکھتاہے۔

حفاظت وحی قرآنی کاجونادرونایاب اوریکتا نظام کیاگیاوہ صرف قرآن مجید کاہی خاصّہ ہے۔ دیگرکتب الٰہی کے لیے ایسابےچوک وبےخطا(Fool-Proof) انتظام قرآن وحدیثِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نیزخودکتب سابقہ کسی سے ثابت نہیں ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب سورہ النحل کی آیت۸۹ پربھی قرآن مجید کی آفاقیت کےتعلق سے ضروری مباحث آجائیں: وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيْداً عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْداً عَلَى هٰـؤُلَاء وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (النحل: ۸۹)

ترجمہ شیخ الہند محمود حسنؒ:"اورجس دن کھڑاکریں گےہم ہرفرقہ میں ایک بتلانے والا ان پرانہی میں کااور تجھ کولائیں بتلانےکوان لوگوں پر(۷)اوراتاری ہم نے تجھ پرکتاب کھلا بیان ہرچیزکا(۸)اورہدایت اوررحمت اورخوشخبری حکم ماننے والوں کے لیے (۹)"۔

تفسیر شبیر عثمانیؒ:(۱۷)"یعنی وہ ہولناک دن یادرکھنے کے قابل ہے جب ہرایک پیغمبر اپنی امت کے معاملات کےمتعلق بارگاہ احدیت میں بیان دے گا۔اورآپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کی حالت بتلائیں گے، بلکہ بعض مفسرین کے قول کے موافق آپ ان تمام شہداء کے لیے شہادت دیں گے کہ بیشک انہوں نے اپنا فرض منصبی بخوبی ادا کیا۔حدیث میں آیا ہے کہ اس امت کے اعمال ہرروز حضور صلی اللہ علیہ سلم کے روبرو

(۱۷) شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، مکتبہ جاوید، دیوبند، ۲۰۰۹ء، ج دوم، ص ۷۷۴۔ ۷۷۵

پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ اعمال خیر دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور بداعمالیوں پر مطلع ہو کر نالائقوں کے لیے استغفار فرماتے ہیں"۔

(۸) "تِبْیَاناً لِّکُلِّ شَيٍ": یعنی قرآن کریم میں تمام علومِ ہدایت اور اصولِ دین اور فلاحِ دارین سے متعلق ضروری امور کا نہایت مکمل اور واضح بیان ہے۔ اس میں قیامت کے وہ واقعات بھی آگئے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اندریں صورت جس پیغمبر پر ایسی جامع کتاب اتاری گئی اس کی ذمے داری بھی بہت بھاری ہوگی۔ گویا، "شَہِیْداً علیٰ ھٰٓؤُلَآءِ" آنے کے بعد "وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَاناً لِّکُلِّ شَیْءٍ وَہُدًی وَرَحْمَۃً وَبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْن" فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم مرتبے اور اسی مرتبہ کے مناسب ذمے داری کی طرف اشارہ فرمادیا "فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِیْنَ أُرْسِلَ إِلَیْہِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِیْن" (الاعراف: ٦)۔ ابن کثیر نے اس کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے: "وَہُدًی وَرَحْمَۃً وَبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْن" یعنی یہ کتاب سارے جہان کے لیے سرتاپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے، فرمانبردار بندوں کو شاندار مستقبل کی خوشخبری سناتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تفسیر بیان القرآن میں "وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَاناً لِّکُلِّ شَیْءٍ وَہُدًی وَرَحْمَۃً وَبُشْرَی لِلْمُسْلِمِیْن" (النحل:۸۹) کے تحت فرماتے ہیں کہ "حیات انسانی کے تمام مسائل کا حل قرآن میں موجود ہے۔ قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت ورحمت اور بشارت ہے جو مسلم یعنی اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں"[(۱۸)]۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت "تِبْیَاناً لِّکُلِّ شَیْءٍ" کے تحت فرماتے ہیں: "ہر ایسی چیز کی وضاحت جس پر ہدایت وضلالت اور فلاح وخسران کا مدار ہے، جس کا جاننا راست روی کے لیے ضروری ہے، جس سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہوتا ہے"۔ غلطی سے لوگ "تِبْیَاناً لِّکُلِّ شَیْء" اور اس کی ہم معنی آیات کا مطلب یہ لے لیتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ بیان کردیا گیا ہے، پھر وہ اسے نباہنے کے لیے قرآن سے سائنس اور فنون کے عجیب مضمون نکالنے کی کوشش شروع کردیتے ہیں...یعنی جو لوگ آج اس کتاب کو مان لیں گے اوراطاعت کی راہ اختیار کرلیں گے ان کو یہ زندگی کے ہر معاملے کی صحیح رہنمائی دے

---

(۱۸) ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، تاج کمپنی، دہلی، ۲۰۱۳ء، ج چہارم، ص ۲۶۱

گی"۔[۱۹]

مولانا امین احسن اصلاحی النحل ۸۹ میں "تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ" کے تحت فرماتے ہیں کہ "یہ اس چیز کا حوالہ ہے جو اس دنیا میں حق کی گواہی اور لوگوں پر اتمام حجت کا ذریعہ ہے۔ فرمایا کہ تمہارے اسی فرض منصبی کے تقاضے سے ہم نے تم پر کتاب اتار دی ہے جو شہادت حق کے لیے تمام پہلوؤں سے جامع و مکمل اور ہر متعلق چیز کو اچھی طرح واضح کر دینے والی ہے تا کہ کسی کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے"۔[۲۰]

اخیر میں سورہ المومنون کی آیات ۵۱ اور ۵۲ کی روشنی میں تمام مباحث کو سمیٹا جائے گا لہٰذا پہلے ان آیات کی متداول تفسیر پیش کی جائے گی اور بعد میں بقدر ضرورت اس پر تبصرہ رکھا جائے گا۔ ارشاد ربانی ہے: يَآ أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْمٌ. وَإِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (المومنون:۵۱۔ ۵۲)

ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: "اے پیغمبرو! کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح، تم جو کچھ بھی عمل کرتے ہو میں اس کو خوب جانتا ہوں اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس مجھ ہی سے ڈرو"۔

تفسیر تفہیم القرآن: "پچھلے دور کوعوں میں انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد اب "يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ" کہہ کر تمام پیغمبروں کو خطاب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہیں یہ سارے پیغمبر یکجا موجود تھے اور ان سب کو خطاب کر کے یہ مضمون ارشاد فرمایا گیا بلکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر زمانے میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں میں آنے والے انبیاء کو ایک امت، ایک جماعت اور ایک گروہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے طرز بیان یہاں ایسا اختیار کیا گیا کہ نگاہوں کے سامنے ان سب کے ایک گروہ ہونے کا نقشہ کھینچ جائے، گویا وہ سارے کے سارے ایک جگہ جمع ہیں اور سب کو ایک ہی ہدایت دی جا رہی ہے۔ مگر اس طرز کلام کی لطافت اس دور کے بعض کند ذہن لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکی اور وہ اس سے یہ نتیجہ نکال بیٹھے کہ یہ خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے انبیاء کی طرف ہے اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سلسلۂ

(۱۹) سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، بدون سنہ، دوم، ص ۵۶۴

(۲۰) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۹۷ء، ج چہارم، ص ۴۳۸

نبوت کے جاری ہونے کا ثبوت ملتاہے۔ تعجب ہے جولوگ زبان وادب کے ذوق لطیف سے اس قدر کورے ہیں وہ قرآن کی تفسیر کرنے کی جرأت کرتے ہیں...‘‘[۲۱]

’’تمہاری امت ایک ہی امت ہے‘‘یعنی تم ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔امت کا لفظ اس مجموعۂ افراد پر بولا جاتاہے جوکسی اصل مشترک پر جمع ہوں۔انبیاء چونکہ اختلاف زمانہ ومقام کے باوجود ایک عقیدے، ایک دین اور ایک دعوت پر جمع تھے،اس لیے فرمایا گیا کہ ان سب کی ایک ہی امت ہے۔بعد کا فقرہ خود بتارہاہے کہ وہ اصلِ مشترک کیا تھی جس پر یہ سب جمع تھے۔

تفسیر مفتی شفیع عثمانی:’’اس آیت (یعنی المومنون:۵۱) میں یہ بتلایا گیاہے کہ تمام انبیاء علیہ السلام کو اپنے اپنے وقت میں وہ ہدایات دی گئی ہیں۔ایک یہ کہ کھانا حلال اور پاکیزہ کھاؤ، دوسرے یہ کہ نیک عمل صالح کرو اور جب انبیاء علیہ السلام کو یہ خطاب کیا گیا جن کو اللہ نے معصوم بنایاہے تو ان کی امت کے لوگوں کے لیے یہ حکم زیادہ قابل اہتمام ہے اور اصل مقصود بھی امتوں ہی کو اس حکم پر چلاناہے‘‘[۲۲]۔

تفسیر بیان القران از ڈاکٹر اسرار احمد: ان دو آیات کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کا تعلق ایک ہی امت یا جماعت سے ہے،جن کی تعداد بعض روایات کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور ۳۱۳ رسول ہیں‘‘[۲۳]۔

تفسیر تدبر قرآن میں ذیلی عنوان’’تمام رسولوں کو مشترک ہدایت کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:’’یہ اس ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو دی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو کچھ تم کروگے میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں‘‘[۲۴]۔

قارئین کرام نے غور فرمایا کہ سورہ المومنون آیات ۵۱۔۵۲ کے تحت متذکرہ بالا تمام

---

[۲۱] سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ترجمان القرآن لاہور، بدون سنہ، ج سوم، ص ۲۸۱۔۲۸۲

[۲۲] محمد شفیع عثمانی، معارف القرآن، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ج ششم، ص ۳۱۷۔۳۱۸

[۲۳] ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، تاج کمپنی، دہلی، ۲۰۱۳ء، ج پنجم، ص۱۷۹

[۲۴] امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۹۷، ج پنجم، ص ۳۲۵

مفسرین یہ تو مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو پاک وطیب کھانے اوراعمال صالحہ کا مختلف زمانے اور مقامات پر حکم دیا، لیکن اس حکم کی تفصیل میں وہ یہ نہیں بتاتے کہ وہ حکم ان پر نازل شدہ کتابوں تورات، انجیل، زبوراور صحف ابراہیم وغیرہ کی وحی کی شکل میں آیا یا نہیں، البتہ ہم یہ بلاتردد عرض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں "يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً" کے کلمات قرآن مجید کی وحی کا حصہ ضرور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ رسولوں سے یہ خطاب جو قرآن میں موجود ہے وہ ان سے عالم ارواح میں کیا گیا یا عالم امثال میں یا عالم حقیقت میں۔ اس کا جواب بھی اکثر مفسرین یہی دے رہے ہیں کہ یہ عالم حقیقت میں ان سے خطاب کیا گیا ہے، یعنی جس جس زمان ومکان میں وہ مبعوث ہوئے انہی میں یہ ہدایات دی گئیں۔ احوال وحی کا یہ اشکال اس لیے پیش آرہا ہے کہ ہم وحی الٰہی اوروحی قرآن اور کلام اللہ کو اپنے زمان ومکان میں محدودومقیدمان رہے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بات نہیں بتلائی۔ بلکہ ہمارے اسلاف خصوصاً امام احمد بن حنبلؒ نے قرآن مجید کو کلام اللہ مان کر صفت الٰہی تسلیم کیا ہے اور حادث وقدیم کی کلامی بحثوں کا مسکت جواب دے دیا ہے[۲۵]۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام موسوم بہ القران الکریم، المجید، الحکیم وغیرہ جو ۵۰ سے زائد صفاتی ناموں سے متصف ہے، یہ صفات واوصاف ہی اس کی عظمت ووسعت اوراعجاز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ذاتی یکتا، ازلی وابدی اور لامحدود پہلوؤں اور لامحدود کیفیاتی وکمیاتی ابعاد کا زندہ وجاوید حوالہ ہیں۔

قرآن مجید اوراللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کی بعض یکساں صفات (مثلاً کریم، حکیم، نور، علیّ، ہادی، حق، بشیر، نذیر، مجید وغیرہ) کی بنیاد پر آفاقیت قرآن کی جو امتیازی تعبیر سامنے آتی ہے، وہ ہم نے اپنے ایک گزشتہ مقالے میں اس طرح پیش کی ہے:

> آفاقیت قرآن اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی علمی، عملی اور معنوی تعبیر ہے، جن کی بنیاد پر مخاطبین قرآن کو اپنی زندگی ڈھالنے کی تعلیم دی گئی ہے اوراسی میں آفاقیت قرآن کا راز مضمر ہے۔ اسی کو قرآن صبغۃ اللہ کہتا ہے یعنی باری تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی بنیاد پر مومن کو صبغۃ اللہ کی

---

[۲۵] سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات ونشریات، بدون تاریخ، جلد ۱، ص ۸۴۔۱۰۰

منزل تک پہنچنا ہی قرآن کی آفاقیت سے عبارت ہے، جس کو شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق حاصل کرنے کا خدائی حکم ہے کیونکہ نبی خاتم پر اتمامِ نعمت اور اکمالِ دین کے ذریعے ہی شریعت محمدیؐ کا قالب عطا کر کے فلاح دارین کا پروانہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا آفاقیت قرآن ہی میں دین کی عالمگیریت، قرآن مجید کی انقلابیت واعجاز اور شریعت محمدیؐ کی تسہیل پسندی و عملیت سبھی کچھ موجود ہے[۲۶]۔

سورہ المومنون کی آیات ۵۱-۵۲ پر آفاقیت قرآن کے خصوصی تناظر میں تدبر کی غرض سے ان آیات پر ایک نظر ڈالیں ارشاد ربانی ہے: يَآ أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْمٌ۔ وَإِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (المومنون:۵۱- ۵۲)۔

ترجمہ: ”اے رسولو! پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ میں تمہارے عمل سے (خوب) واقف ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور یہ امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں پس تم میرا ہی تقویٰ اختیار کرو“۔

(۱) یہ خطاب اللہ تعالی اپنے برگزیدہ بندوں سے کر رہا ہے جن کو اس نے کارِ رسالت کے لیے منتخب کیا ہے اور جن کو اب اسوہ ونمونہ بننا ہے، کہ تم پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو اور یاد رکھو کہ تم جو کچھ کروگے اس سے میں خوب واقف ہوں۔

اس حقیقت سے ہر صاحب علم واقف ہے کہ تمام شرائع الٰہی میں ”كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً“ کا حکم موجود ہے۔ البتہ یہاں جو پہلو قابل غور ہے وہ یہ کہ دینِ اسلام کی اممِ سابقہ سے بھی مقدم ان کے رسولوں کو یہ حکم دیا گیا تاکہ وہ جو کچھ دوسروں کو حکم دیں اس سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھائیں اور ان کا عمل دوسروں کے لیے بہترین نمونہ بنے۔ قرآن مجید کی یہ تعلیمات عوام وخواص میں تفریق کی قائل نہیں اور شریعت کی پابندی سے کسی کو ہرگز مفر نہیں اور یہ عدل کا تقاضا ہے کہ جو حکم مطیع کے لیے ہو وہی مطاع پر بھی نافذ ہو۔ یہ اخوت ومساواتِ انسانی کا اعلیٰ معیار ہے، فطرتِ انسانی کی آواز ہے اور یہ آفاقیتِ قرآن کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

---

[۲۶] سید مسعود احمد و ظفر دارک قاسمی(تحقیقات اسلامی میں داخل اشاعت)”آفاقیت قرآن: عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں“ کا نکتہ نمبر ۱۶

(۲) "كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ" فطرت کی آواز اس طرح سے بھی ہے کہ یہ معروف کا حکم بھی ہے بلکہ معروف کی اعلیٰ مثال بھی۔ کیونکہ کھانا بشری ضرورت ہے البتہ اس کو حلال وطیب، اکل وشرب ہی سے انسان خود کو مشروط و محدود کردے اور حلال طریقہ سے حاصل کرنا اپنا فریضہ سمجھے کہ یہ اس کی احسن تقویم اور حسنِ اخلاق کا تقاضا ہے۔ یہ "فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" (الروم:۳۰) کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اس میں آفاقیت کی جو وسعتیں انسانی عقل وشعور میں آتی ہیں وہ غیر معمولی ہیں۔ یہاں اس حقیقت کی تردید بھی ناممکن ہے کہ کھانے پینے کا براہ راست اثر انسانی افکار واعمال پر پڑتا ہے، لہٰذا قرآن مجید میں "كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ" کے بعد "وَاعْمَلُوا صَالِحًا" کا لانا حکمت سے خالی نہیں جو نہ صرف ایک جامع پاکیزہ طریقۂ اکل وشرب کے بعد دوسرا پاکیزہ عمل ہے (جو ہر شعبۂ حیات میں انجام دینا ہے)۔ یہ حکم اس پاکیزہ نظام کو ایک سلسلۃ الذہب میں جوڑنا سکھاتا ہے بلکہ ایک فعل دوسرے کو تقویت دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ پاکیزہ کھانے سے پاکیزہ اعمال بجا لانے کی توفیق بھی ملتی ہے۔ انسانی زندگی میں نورانیت پروان چڑھتی ہے اور اس سے بڑھ کر مومن کی دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ پاکیزہ طریقوں سے حاصل کیا پاک (طیب) حلال رزق کے ساتھ اعمال صالحہ کو بجا لانے میں ہی ہے، جیسا کہ نبی خاتم علیہ السلام کا فرمان اس کا شاہد ہے کہ ناپاک طریقوں سے حاصل کیا حرام و ناپاک رزق پر پلا بڑھا انسان خدا سے لمبی دعاؤں کے مانگنے کے باوجود دعاؤں کی استجابت کا استحقاق کھو بیٹھتا ہے۔

(۳) "كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَات" میں امر کے صیغہ نے خاص طور پر رہبانیت (Monasticism) کی جڑ کاٹ دی ہے بلکہ احسن تقویم پر تخلیق کردہ مخلوق کو خلافت ارضی سے نواز کر اس کی بقا وارتقاء اور تکمیل کے اس طرح سامان کیے کہ مادّی رزق تو اس کی مادّی بقا کے لیے ناگزیر تھا مگر روحانی بقاء وارتقاء کے لیے وحی الٰہی کے روحانی رزق کا بھی محتاج بنا کر اوج ثریا کے مقام پر پہنچانے کے سامان کیے۔ اس طرح مادی اور روحانی دونوں اسلحہ جات سے لیس کر کے پھر اس کو عمل صالح کا حکم دیا اور اس کے ساتھ اپنی صفت "علیم" کا حوالہ دے کر اس کی بقا وارتقاء کی تکمیل کا ایک جاندار لائحۂ عمل مقدر و مقرر فرمایا۔

(۴) "كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا" کے بعد آیت کا اختتام "اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ" سے کر کے رب کریم نے زندگی کے ہر عمل پر اپنی نگرانی کے پہرے بٹھا دیے ہیں کہ انسان یادرکھے کہ اس کا رب ہر آن اس کے عمل کو دیکھ رہا ہے وہ اگر ذرّہ برابر راہِ حق سے ہٹا تو اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی لہٰذا اس کج روی پر توبہ واجب ہوگئی اور اگر توفیق ایزدی سے یہ چند لمحات مطلوبہ معیار کے مطابق گزر گئے تو اس پر شکر الٰہی واجب ہوگیا۔ قرآن مجید کی یہ چھوٹی سی تین کلماتی ہدایت انبیاء کرام تو کجا ایک عام مومن کو بھی مجسم نور بنا سکتی ہے تو کار رسالت انجام دینے والوں کو نورعلیٰ نور کے کن مقامات سے ہمکنار کرا سکتی ہے اس کا تصور وادراک ایک عام عقل سے پرے ہے۔ اب ذرا سوچیں کہ عوام وخواص پر مشتمل معاشرہ اگر اس تین کلماتی ہدایت کا حقیقی حامل بن کر دکھائے تو وہاں کس طرح امن وچین، محبت ویگانگت، مثبت تعامل وتعاون، ایثار وقربانی اور اخوت وہم آہنگی کا ظہور ہوگا اور کس طرح سے نفرت، تعصب، خود نمائی، تمسخر اور دیگر رذائل اخلاق اور فساد کی جڑ سرے سے کٹ جائے گی۔

(۵) "اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ" کے براہ راست مخاطب جب تمام انبیاء ورسل علیہم السلام ہیں اور ان کے عمل پر خدائی آنکھ (Divine CCTVs) کی ہر وقت موجودگی ان کے لیے انذار و بشارت کے ساتھ ہر آن خوف خداوندی اور تسلی دونوں کیفیات سے ہم کنار کرتی رہتی ہے تو عوام الناس پر اس خدائی پہرے کی پرتیں کتنی سخت ہوں گی اس کو اگلی آیت کے فَاتَّقُوْن سے سمجھیے۔ اور اس ٹکڑے کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے جمال کو مسخ ہونے سے کس پیارے طریقے سے روکا اور بند باندھا ہے اس پر سر دھنیے۔

(٦) اگلی آیت "وَإِنَّ هٰذِهِ اُمَّتُكُمْ أُمَّةً واحدةً وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ" نے پچھلی آیت کے پیغام کو مطلوبہ معیار پر برپا ہونے والے معاشرے کی نورانیت پر چار چاند لگا دیے اور اس کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اور توحید الٰہ پر مبنی اخوت ومساوات انسانیت کا حامل ایک فکر ونظام سے مربوط گروہ کا ایسا نقشہ پیش کیا کہ جس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب، کسی نظریے، کسی فلسفے میں ملنا مشکل ہے۔

نیز "وَاَنَا رَبُّكُمْ" میں جو محبت واپنائیت کی شان ہے اور پھر فَاتَّقُوْنِ میں جو توازن پیدا کیا

گیاہے وہ بھی قابل ستائش ہے۔ محض زیر بحث آیات پر مبنی قرآن مجید کی یہ آفاقیت جملہ مکلف مخلوقات عالم پر محیط ہے اوراُن سب کی خیر خواہی، بقا اورارتقاء کی ضمانت دیتی ہے اوران سب کو اس وحی الٰہی "یآ ایھا الرُّسل" کے ذریعے فیضان ہدایت کی دعویدار ہے۔ آفاقیت قرآن کی یہ جہت دراصل زمان و مکان کی محدود یتوں سے بالاتر ہوکر ہر مخلوق عالم کی عموماً اور مکلف مخلوقات کی خصوصاً فلاح ونجات سے آگے بڑھ کران کو حقیقی ارتقاء کی اوج ثریا پر پہنچاناچاہتی ہے۔ قرآن مجید کی یہ آفاقیت کائنات اور انسان کی فطرت سے ہم آہنگی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اور مسائل انسانیت کا حقیقی، دیرپا اوران کے شایان شان حل پیش کرنے کا دعوی کرتی اوران کے انفرادی و اجتماعی امن وسکون اوردائمی سلامتی کی نقیب اورجملہ شعبہ ہائے حیات کواس صراط مستقیم اورشاہراہِ حق پر گامزن کرتی ہے جس کی آخری منزل جنت الفردوس اوررضائے رب کریم ہیں۔

(۷)ان دو آیات میں کلام اللہ کا جو ادبی، صوتی اور اسلوبیاتی حسن و جمال ہے اس کو آفاقیت کی ادبی وشعری تاریخ میں جھانکیے[۲۷] جس نے اسلاف سے اخلاف تک قرآنی اعجاز کو تحدّی کے اس نکتے تک پہنچادیا کہ جس پر اس امت کو "خیر امت" کہنا کم ازکم اس حیثیت سے توبالکل درست وبرمحل نظر آتاہےکیونکہ امت مسلمہ ہی نے سجستانی سے باقلاّنی، جُرجانی اوررُمّانی تک اوربیسیویں صدی میں سید قطب سے بنت الشاطی تک قرآن کے ادبی، لسانی اورصوتی جمال ومنظر کشی کاسب کوگرویدہ کردیا۔ لہٰذاآفاقیت قرآنی کی بے شمار جہات محض زیر بحث ان دوآیات قرآنی ہی میں بدرجۂ اتم جلوہ افروزہوتی نظر آتی ہیں تو ماہرین علم کی تصوراتی پرواز کاکیاکہنا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ کلام اللہ مخصوص وامتیازی وحی الٰہی کے ذریعے ہی توزمان ومکان سے منزہ و مبرا قرار پاتا ہے، لہٰذا اس حقیر کو "یآ ایھاالرُّسل" کی وحی الٰہی میں 'گویا' کا تکلف بھی درست نہیں لگتا۔اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جانب سے کی جانے والی قرآنی وحی

[۲۷] سید مسعود احمد، وسیف اللہ اصغر اصلاحی، قرآن کا تصورآفاقیت: لغوی وفکری مباحث کے آئینہ میں، معارف، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، مارچ ۲۰۲۵ء، ص ۵۔۱۱

لوح محفوظ سے نزولِ اجلال فرما کر ساری کائنات کا ہر آن احاطہ کرتی رہتی ہے۔ انبیاء کرامؑ کو دیے گئے خصوصی آلاتِ وصولِ وحی الٰہی اس کو مخصوص زمان و مکان میں اخذ کر لیتے تھے، جس طرح ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن سے براڈکاسٹ کیا گیا پیغام ساری کائنات میں موجود ہوتا ہے اور جن لوگوں کے پاس ریڈیو/ٹی وی سیٹس ہیں وہ خاص فریکوینسی (Special Frequency) پر ٹیوننگ(Tuning) کر کے مطلوبہ پیغام حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح آج کل یوٹیوبرز(You-tubers) اپنا بلاگ انٹرنٹ پر اپلوڈ (Upload) کر دیتے ہیں اور قرأت و دروسِ قرآن ہم اپنے موبائل کے ذریعے جب اور جہاں چاہیں سن اور دیکھ سکتے ہیں۔ جب دنیا کی حقیر ٹیکنالوجی جو اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے، وہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے تو اللہ تعالیٰ کو ان تمام معاملات میں اوفق وبرتر سمجھنا تو ہمارے ایمان کا لازمی جزء ہے۔

اب صرف ایک سوال کا جواب باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ وحی الٰہی تو جوہری طور پر ایک ہی ہے۔ اس کا جواب بھی قرآن اور احادیث سے مل جاتا ہے کہ جس طرح تورات، انجیل اور زبور دراصل سب کلام الٰہی ہی ہیں البتہ وہ کلام الٰہی کے پرانے ایڈیشن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ"(المائدہ:۳) جیسی آیات کے ذریعے اس آخری کلام کی امتیازی حیثیت اجاگر کر دی ہے۔ لہٰذا جس طرح (Information Technology) کے میدان میں ہر نیا ماڈل جدید (Advanced) ٹیکنالوجی کا استعمال کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی ترسیلِ وحی کے لیے نادر وجدید طریقہ اختیار کیا ہو، کیا بعید ہے۔ سورہ الجن:۸-۱۰، الاحقاف: ۲۹-۳۲، فصلت:۴۱-۴۲ وغیرہ آیات ہمارے فہم وحی اور حفاظت وحی کو مزید تقویت دیتی ہیں جن میں آسمان پر خصوصی پہرہ اور قرآنی وحی کی خصوصی حفاظت کا اشارہ ملتا ہے۔

مزید غور فرمائیں کہ صرف قرآن مجید کی یکتا خدائی حفاظت(الحجر:۹، الاعلیٰ:۶)، نزول وحیِ قرآن کی خصوصی حفاظت (فصلت:۴۱-۴۲) اور قرآن مجید کی اہتمامی تنزیل (فصلت: ۴۲، الحاقہ:۴۳) نیز قرآن مجید کی خصوصی جمع و تدوین (القیامۃ:۱۷-۱۹) اور امتیازاتِ قرآنی کے لیے خصوصی آیات اور اس کی عظمتِ جلالت کو متعدد مترادف اوصاف کے علاوہ قسمیہ انداز میں پیش کرنا (قٓ:والقرآن المجید؛یٰس والقرآن الحکیم؛وغیرہ) مزید برآں قرآن مجید کی پانچ بار تحدی وغیرہ متعدد صفات قرآن مجید کی آفاقیت کو مؤید ومؤکد ہی نہیں کرتی بلکہ آفاقیت

قرآنی کو نادر ونایاب جہات فراہم کرتی ہیں جن کا عشرعشیر بھی کسی دوسری کتاب مقدس میں کیفیاتی یا کمیاتی سطح پر نہیں پایا جاسکتا۔ قرآن ماضی،حال اور مستقبل کے تمام انسانوں بشمول انبیاء کرام (المومنون:۵۱) سبھی کو خطاب کرکے مناسب بلکہ کامل رہنمائی کا دعویدار ہے۔ اس قرآن میں ہمارا ہی ذکر ہے (الانبیاء:۱۰)۔ اس نے ماضی کے لوگوں کو بھی اپنے زمانوں میں حقائق کی یاددہانی کا دعویٰ کیا (الانبیاء:۲۴) اور یہ قیامت تک تمام مکلف مخلوقات کے لیے نصیحت و یاد دہانی بنا کر بھیجا گیا (الواقعہ:۸،التکویر:۲۷)۔ یہ جنوں اور انسانوں دونوں مکلف مخلوقات کو بیک وقت تذکیر وتنبیہ اور ہدایت کرتا ہے (الرحمٰن:۱۳- تا خاتمہ؛ سورہ الاحقاف: ۲۹-۳۲؛ الجن:۸-۱۰) قرآن مجید کی کامل و مکمل رہنمائی یعنی اس کے ذریعے عالم گیر ہدایت عامہ وتامہ صرف اسی کتاب کا یکتا امتیاز اور خاصّہ ہے(المائدہ :۳، الانعام :۵۹،النحل:۸۹)۔ اس کتاب کی خصوصی اور جامع آیات پر مبنی ہدایات جو آیتِ برّ (البقرہ: ۱۷۷)، آیت الکرسی (البقرہ: ۲۵۵)، آیت دَین (البقرہ:۲۸۲)، آیت جامع امر و نہی (النحل: ۹۰)، آیت توصیفِ قرآن(یونس: ۵۷)، آیات توحید (الحشر:۲۲-۲۴) اورسورہ اخلاص وغیرہ سینکڑوں آیات اس آسمان ہدایت میں درخشاں ستاروں کی مانند ہیں اورسب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی آفاقیت ہر لمحہ ارتقا پذیر ہے جس کو فصلت کی ۵۳ ویں آیت لگاتار مہمیز لگاکر ماہرین علم وسائنس کو چیلنج کررہی ہے کیونکہ زمان ومکان کے ہردم بدلتے مظاہراتی فریم میں انسان کا علمی افق بھی وقت کے گزرنے سے بلندتر اور وسیع تر ہوتا جاتا ہے اوراس نئے علمی فریم میں اہل دانش کے لیے اطمینانِ قلب کے ن ت نئے ذرائع فراہم ہوجاتے ہیں۔ قرآن مجید ہی وہ واحد کتاب الٰہی ہے جس کو جملہ مکلف مخلوقات عالم کے لیے نہ صرف نذیراً (الفرقان:۱) بلکہ برہان(النسا :۱۷۴) اور فرقان (البقرہ: ۱۸۹، الفرقان:۱) بنا کر بھی بھیجا گیا ہے۔ اس کتاب الٰہی نے انسانی فلاح اور فائز المرامی کا وہ جامع اور سہل الاصول تصور دیا جس پر غیر دانتوں تلے انگلی دبانے اوراپنے لوگ عش عش کرنے پر مجبور ہیں (المومنون:۱- ۱۰،العصر:۱-۳)۔ دراصل آفاقیتِ قرآن کے بے شمار پہلو، ابعاد اورجہات ہیں۔ یہ مضمون وحی الٰہی کی ایک نئی سائنسی جہت سے آفاقیت کو سمجھنے سمجھانے کی جانب ایک ادنی قدم ہے۔

مرد وزن کے معاشرتی تعلقات: ایک وجودیاتی مطالعہ عہد نبوی کی روشنی میں

عامر فہد

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی

fahadamiramu@gmail.com

معاشرہ محض افراد کا ہجوم نہیں بلکہ ایک ایسا معنوی پیکر ہے جو باہمی ربط، اقدار کی ہم آہنگی اور وجودی شعور سے تشکیل پاتا ہے۔ جب یہی معاشرہ خاندان کی صورت میں متشکل ہوتا ہے تو مرد وزن کی باہمی شرکت اسے استحکام عطا کرتی ہے۔ یہ رشتہ، جو زوجیت میں ڈھلتا ہے، محض جذباتی یا معاشی بندھن نہیں بلکہ ایک وجودی تکمیل ہے، جس کے بغیر انسانی تمدن اپنی معنویت سے محروم رہتا ہے۔ قرآن جب کہتا ہے: بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ —تو یہ محض صنفی توازن کی نہیں بلکہ روحانی یکجائی کی گواہی ہے۔ آدم و حوا کا ایک ساتھ زمین پر اترنا اس بات کا اعلان ہے کہ انسانی تاریخ کا آغاز بھی باہمی رفاقت سے ہوا، نہ کہ کسی ایک کے غلبے یا دوسرے کے انکار سے۔ اسی طرح وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ کہہ کر قرآن انسان کی تکریم کا اعلان کرتا ہے —مرد ہو یا عورت، ہر ایک اپنے فطری مقام، ارادے کی آزادی اور اخلاقی وقار کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ یوں اسلام کی نظر میں عورت کوئی ثانوی وجود نہیں بلکہ انسانی روح کا مکمل اور محترم جزو ہے۔

لیکن مسلم معاشروں میں، خصوصاً روایت پرست دینی حلقوں میں، عورت کی معاشرتی فعالیت کو اکثر تنگ نظری کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس پسپائی کی جڑیں محض مذہبی تعبیرات میں نہیں، بلکہ ان فکری الجھنوں میں پیوست ہیں جو مرد وزن کے تعلق کو یا تو سختی سے محدود کرنا چاہتے ہیں یا بے مہار آزادی میں تحلیل کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ المیہ صرف مذہبی فکر کا نہیں، بلکہ جدید مغرب زدہ اذہان نے بھی اس کا گہرا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے عورت و مرد کے فطری، متوازن اور باوقار روابط کو آزادی کے نام پر ایک تجارتی شے میں بدل ڈالا۔ اس جذباتی و تہذیبی طغیانی کے ردِّ عمل

میں کئی مذہبی مفکرین خوفزدہ ہو کر انتہاپسندی کی طرف جھک گئے اور یوں ایک ایسا ردّ عمل پیدا ہوا جس نے عورت کی زندگی پر غیر فطری قدغنیں عائد کر دیں۔ سماجی بگاڑ کے خوف سے مرد وزن کے بیچ ایک ایسی دیوار اٹھادی گئی جو نہ صرف فکری طور پر غیر متوازن تھی بلکہ تمدنی ارتقاء کے منافی بھی۔ عورت کو چاردیواری میں اس طرح محصور کر دیا گیا گویا وہ اپنے معاشرے کی نہیں بلکہ صرف اپنے گھر کی شہری ہو۔ اس کے باہر نکلنے، معاشرے میں کردار ادا کرنے، اور فکری و معاشی سطح پر اشتراک کی تمام راہیں مذہب کے نام پر بند کر دی گئیں۔

مثال کے طور پر بعض دینی روایتی حلقوں میں اب بھی خواتین کی معاشی سرگرمیوں کو بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا۔ اس کی وہی دلیل دی جاتی ہے کہ عورت پر مال وکسب کی ذمہ داری نہیں ہے لہٰذا اسے کمانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کے بعد اس پر تجارت وکسب اور دستکاری وحرفت اور نوکری کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ جبکہ عہد نبویؐ کے واقعات سے اصل اصول اور واقعات دونوں ابھر کر سامنے آتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں خواتین کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ کسب معاش کے چاروں ذرائع تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور مزدوری واجرت کو اختیار کریں اور اپنی معیشت کو بہتر کریں اور خواتین حقیقت میں ان کے ذریعے مال و دولت کماتی تھیں۔ صرف پیٹ بھرنے کی حد تک نہیں اور نہ صرف تن ڈھانکنے اور سر چھپانے کی حد تک بلکہ باقاعدہ دولتمندی کے حصول کے لئے بھی۔ یہ حق و آزادی اور واقعہ تاریخی عہد نبویؐ کے مکی اور مدنی دور میں بھی استوار رہا اور خواتین ان چاروں ذرائع سے آمدنی حاصل کرتی اور دولت جمع کرتی رہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ شریعت اسلامی بے محابا، بے وجہ اور بے قید اختلاط مرد وزن کا قائل ہے بلکہ اسلام کا تصورِ معاشرت ایک ایسا متوازن نظام پیش کرتا ہے جو انسانی فطرت اور سماجی ضرورتوں کے درمیان ایک حسین ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ وہ نہ تو صنفی تعلقات کے نام پر بے مہار اختلاط کا قائل ہے اور نہ ہی مرد وزن کے درمیان ایسا پردہ کھینچتا ہے جو زندگی کے رواں دھارے کو جامد کر دے۔ بلکہ وہ حدود و قیود کے ساتھ ایک ایسی اعتدال پسند فضا قائم کرتا ہے جہاں عورت اپنی نسوانی حرمت کے ساتھ، انسانی وقار اور سماجی اشتراک کے دائرے میں قدم رکھتی ہے۔ اس کی متعدد مثالیں عہد نبویؐ میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

عہد نبویؐ میں مرد وزن کے معاشرتی تعلقات اجتماعی بھی تھے اور انفرادی بھی۔ اس کی ایک اہم مثال حضرت خدیجہؓ کی ہے جو نہ صرف رسول اکرم ﷺ کی شریکِ حیات تھیں، بلکہ وہ آپ کے فکری سفر کی ہم راز، نبوت کے ابتدائی لمحوں کی ہم دم، اور تبلیغ کے اولین مرحلے کی بصیرت شعار ہمسفر بھی تھیں۔ ابن ہشام اور بلاذری گواہ ہیں کہ حضرت خدیجہؓ نے رسالت کے ان ابتدائی آثار کو سمجھنے کے لیے نہ صرف حضرت ورقہ بن نوفل سے تنہا ملاقاتیں کیں بلکہ بعض مواقع پر رسولِ اکرم ﷺ کے ہمراہ بھی ان خدمت گزار مجالس میں شریک ہوئیں[1]۔ یہ ملاقاتیں محض مشورے کے مقصد سے نہ تھیں، بلکہ وحی کے پہلے شعور کی فکری تفہیم، روحانی بصیرت کی تلاش اور ایک نو ظہور وحیانی پیغام کے ادراک کی کوشش تھیں۔

انفرادی ملاقات کے حوالے سے ابن ہشام نے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے کہ جب اہلِ ایمان کو ہجرت حبشہ کے وقت ترکِ وطن کا دکھ سہنا پڑا۔ انہی دنوں حضرت عمرؓ نے، جو ابھی اسلام کی روشنی سے آشنا نہ تھے، جب اپنے قریبیوں کو دیارِ حبیب چھوڑتے دیکھا تو ان کے دل پر غم کے بادل چھا گئے۔ اسی کیفیت میں وہ ایک مسلم جوڑے کے گھر پہنچے، جن میں حضرت عامر بن ربیعہ کے نام کو تاریخ نے محفوظ کیا ہے۔ ان کی اہلیہ ام عبد اللہ لیلی بنت ابی حثمہ، جو ہجرت کے کارواں کی پرعزم رکن تھیں، گھر پر تنہا موجود تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ان سے گفتگو کی، دل کی دھڑکنوں کو زبان دی، اور دل گرفتگی کے ساتھ ہجرت پر افسوس کا اظہار کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مکالمہ مرد وزن کے تعلق کی وہ حسین جھلک پیش کرتا ہے جہاں فہم وشعور، ادب و وقار اور تہذیب و شائستگی غالب ہوتی ہے۔ حضرت عامر اس وقت گھر پر نہ تھے، لیکن ان کی غیر موجودگی میں ان کی رفیقِ حیات نے خلوص و سنجیدگی سے اس گفتگو کو سنا، جواب دیا، اور ہجرت کے اس فیصلے میں ایمانی بصیرت کا عکس ظاہر کیا[2]۔

انفرادی ملاقاتوں کی مثالیں ہمیں مدنی عہد نبویؐ میں مزید دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مدنی عہدِ نبویؐ میں مرد وزن کے مابین جو معاشرتی تعلقات اور باہمی زیارات کی فضا قائم ہوئی، وہ محض رواداری یا مہذب معاشرت کا اظہار نہ تھی، بلکہ وہ ایک روحانی اخوت، ایمانی ہم بستگی اور وجودی ربط کی مجسم

---

(۱) الامام احمد بن یحیی بن جابر البلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: الدکتور ریاض زرکلی، سہیل زکار، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، ۱۹۹۶، جلد اول، ص ۱۱۷۔۱۱۸؛ عبد الملک ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، اردو ترجمہ: سید یسین علی دہلوی، جلد اول، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۹۴، ص ۲۴۰۔

(۲) عبد الملک ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

صورت تھی۔ مکہ میں محدود سماجی تعامل، مدینہ میں ایک ہمہ جہت معاشرتی پیوستگی میں بدل گیا۔ جہاں مہاجر و انصار، مرد و خواتین، سب یکجا زندگی بسر کرتے، ایک دوسرے کے گھروں کے درودیوار سے آشنا ہوتے، اور دکھ سکھ میں شرکت کو دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ یہ زیارات صرف افراد کی ملاقات نہ تھیں، بلکہ قلوب کی ہم آہنگی اور روحوں کی ہمسفری کا عملی مظہر تھیں۔ مہاجرین ومہاجرات انصاری گھروں میں مہمان نہیں، بلکہ اہلِ خانہ بن کر رہے۔ مواخاتِ مدینہ نے جس طرح مردوں کو برادرانہ رشتوں میں جوڑا، اسی طرح عورتیں بھی اس دینی پیوند کا حصہ بنیں۔ ان گھریلو روابط اوراجتماعی زیارات نے سماج کو ایک ایسی وحدت عطا کی جس میں نہ فرد تنہا تھا اور نہ صنف الگ، بلکہ سب مل کر امت کا پیکرِ جمیل بن گئے اوران کے درمیان سماجی آمدورفت اور معاشرتی میل ملاپ ہمیشہ قائم رہااور ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہتے۔ اس کی ایک اہم مثال حضرت ام شریک عامریہ کی ہے جو قریش کے معزز خانوادے بنو عامر بن لوی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا گھر مہاجرین کے لیے جائے پناہ تھا اور ان کی دلنواز مہمان نوازی اس بات کی گواہی تھی کہ مدینہ میں اخوت، رشتے سے بڑھ کر ایک روحانی پیوستگی بن چکی تھی[۳]۔

حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوالدرداء کی مواخاتی نسبت محض رشتہ دارانہ تعلق نہ تھی، بلکہ روحانی ہم آہنگی اور فکری رفاقت کی ایک درخشندہ مثال تھی۔ حضرت سلمان اکثر و بیشتر اپنے مدنی بھائی کے گھر تشریف لاتے، یہاں تک کہ ایک رات جب حضرت ابوالدرداء موجود نہ تھے، حضرت ام الدرداء نے ان کی ضیافت و مدارات کی۔ گفتگو کے دوران حضرت سلمان کو ان کے طرزِ زیست میں شدت کا اندازہ ہوا تو انہوں نے اپنی حکمت ومصلحت سے اعتدال و توازن کا سبق دیا[۴]۔ اس واقعے سے نہ صرف اسلامی بھائی چارے کی عملی جہت واضح ہوتی ہے بلکہ عورت کی معاشرتی اور فکری موجودگی کو بھی باوقار انداز میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ انسانی روابط کی تہذیبی تشکیل میں انفرادی ملاقاتوں کی حیثیت بنیاد کی سی ہوتی ہے، مگر جب یہی روابط اجتماعی سطح پر ابھرتے ہیں تو وہ ایک تمدنی شعور اور اجتماعی شعائر کا عکس بن جاتے ہیں۔

---

(۳) عزالدین ابن الاثیر، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، ب.ت، جلد ششم، ص ۳۵۲۔

(۴) امام ابن حجر العسقلانی، فتح الباری فی شرح البخاری، مکتبۃ دار السلام، ریاض، ۱۹۹۷، جلد دہم، ص ۶۵۶۔

اب ہم عہد نبویؐ میں اجتماعی ملاقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جہاں مرد وزن کی باہمی شرکت ایک سماجی حقیقت کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے اور اجتماعیت کی روح ان میں بولتی نظر آتی ہے۔

عہدِ نبویؐ کے معاشرتی نظام نے اجتماعی شعور، سماجی ربط، اور باہمی تعاون کو اپنی تربیتی حکمت عملی کا مرکز بنایا۔ معاشرتی تعلقات کا یہ اجتماعی روپ دارِ ارقم کی صورت میں واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے جہاں مرد و زن دونوں نے مل کر دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کا ایک مربوط و جامع نظام تشکیل دیا۔ یہ مرکز محض تعلیم کا نہیں بلکہ روحانی اجتماعیت کا محور تھا، جہاں شخصی ترقی اور اجتماعی ہم آہنگی، دونوں ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ حمزہ و عمر جیسے باوقار صحابہؓ کے قبول اسلام کے وقت وہاں خواتین کی موجودگی اس حقیقت کی غماز ہے کہ عہدِ نبویؐ میں تربیتِ امت صرف مردوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ خواتین بھی اس اجتماعی عمل کا سرگرم حصہ تھیں۔

مزید برآں، حبشہ کی طرف ہجرت صرف ایک اضطراری اقدام نہ تھا بلکہ اجتماعی شعور کا مظہر تھا، جس میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی اپنے عزم، وفا، اور شعور کے ساتھ شریک تھیں۔ قیامِ حبشہ کے دوران جو باہمی مشاورت، نظم و ضبط اور فکری اتحاد قائم ہوا، اس میں خواتین کی موجودگی نے اس اجتماعی معاشرتی سانچے کو مزید استحکام عطا کیا۔ حضرت امّ سلمہؓ کی روایات اور چشم دید مشاہدات نے عہدِ نبویؐ میں عورت کی سماجی و فکری شرکت کو زندہ مثال کے طور پر پیش کیا۔

اسی طرح شعبِ ابی طالب میں اجتماعی محصوریت کے تین سال، مرد و زن کے باہمی ایثار، وفاداری اور ایمانی یکجہتی کی روشن تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اسلام کے ماننے والے صرف افراد نہیں، بلکہ ایک مربوط اور ہم فکر سوسائٹی کے پیکر کے طور پر شدید آزمائشوں سے گزرے اور جب مدینہ کی طرف ہجرت کا مرحلہ آیا تو یہ صرف اجسام کا انتقال نہ تھا بلکہ ایک تہذیبی و معاشرتی انقلاب کی اجتماعی بنیاد رکھنا تھا۔ اس سفر میں خواتین کی شرکت، بالخصوص حضرت ام کلثوم بنت عقبہ کا کردار، اس بات کی دلیل ہے کہ معاشرتی تبدیلی کے ہر مرحلے میں عورت مرد کی ہم رزم تھی۔ یہ تعلق صرف صنفی نہیں بلکہ ایمانی، فکری اور تمدنی ہم آہنگی پر مبنی تھا۔

عہدِ نبویؐ میں معاشرتی تعلقات کا یہ ہمہ گیر اور ہم آہنگ نقشہ صرف تعلیم و تربیت، ہجرت و محاصرے اور روحانی اجتماعیت تک محدود نہ تھا، بلکہ یہ روزمرہ زندگی کی معاشی، زرعی، تمدنی اور دینی سرگرمیوں میں بھی پورے حسنِ توازن کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ بازاروں کی چہل پہل، کھیتوں کی

وسعت اور دینی اجتماعات کے روح پرور لمحات ــــ یہ سب دراصل ایک ایسی معاشرتی فضا کے مظاہر تھے جس میں مرد و زن نہ صرف باہمی احترام کے ساتھ شریکِ کار تھے، بلکہ ایک دوسرے کے سہارے سے زندگی کے شعوری اور معاشی بوجھ اٹھا رہے تھے۔

بازاروں میں عورتیں مرد تاجروں سے خریداری کرتیں اور مرد، خواتین تاجرات سے تجارت کرتے؛ مضاربت، اجرت اور اشتراک کی بنیاد پر مردوں کا خواتین کے لیے کارندہ بننا، اس اعتمادِ باہمی کا غماز تھا جو اس نبوی معاشرے کا وصفِ خاص تھا۔ یہ نہ صرف سماجی تفاعل (Social Interaction) تھا بلکہ ایک ایسے تمدنی معاہدے کا مظہر تھا جس میں انسانی شرافت اور دینی اخلاقیات، صنفی امتیاز سے بالاتر ہو کر کام کرتی تھیں۔ زرعی میدان میں بھی یہی ہم آہنگی جاری تھی۔ باغات، کھیتوں اوراموال میں مرد و زن کا شانہ بشانہ کام کرنا، مزدوری میں ایک دوسرے کا معاون بننا، صرف معاشی ضرورت کا اظہار نہ تھا بلکہ اس سے زیادہ یہ ایک اخلاقی اور وجودیاتی رفاقت (Existential Partnership) کا بیان تھا، جو انسانی زندگی کی بنیادوں میں جمی ہوئی تھی۔

دینی اجتماعات بھی اسی اجتماعی روح کے حامل تھے۔ اگرچہ صف بندی میں مرد و خواتین جدا تھے، لیکن تعلیم، تعلم، خیرات اور مشاورت میں وہ ایک دوسرے کے فکری رفیق تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے بعد خواتین کا جذبۂ ایثار میں بے ساختہ اپنے زیورات پیش کرنا، اور حضرت بلالؓ کا ان کے درمیان گھوم کر انہیں جمع کرنا، اس معاشرے کی وہ روحانی وحدت تھی جس نے فرد کو اجتماع کا حصہ بنا دیا تھا۔ یہی شعور، قومی مشاورت کے مواقع پر بھی نمایاں ہوتا ہے، جہاں صحابیات مردوں کے ساتھ مشورے دیتی تھیں، دین کے دقیق احکام پر توجہ دلاتی تھیں اور فکری سوالات اٹھاتی تھیں۔ ان کا علمی و فکری وجود اس بات کی دلیل تھا کہ عہد نبویؐ کا معاشرتی نظام، عورت کو محض جذباتی یا خانگی دائرے میں محدود کرنے کے بجائے، اسے عقل، اخلاق اور قیادت کے میدان میں بھی قابلِ قدر مقام دیتا تھا۔

اس روحانی و معاشرتی تعلق کا ایک لطیف پہلو وہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپ جن خواتین کے گھروں میں تشریف لے جاتے، ان کی زیارت بعدِ وفات رسولؐ بھی خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام کے ہاں سنتِ جاریہ کی حیثیت رکھتی۔ حضرت ام ایمن کا گھر صحابۂ کرام کے لیے مقامِ زیارت تھا، اور حضرت شہیدہ کے یہاں بھی صحابہ برابر حاضری دیتے۔ یہ

محض رسمِ تعظیم نہ تھی بلکہ روحانی وراثت کی تکریم تھی جو اس تمدن کی فکری گہرائی کی علامت تھی۔

یوں عہدِ نبوی کا معاشرتی خاکہ ہمیں بتاتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں معاشرتی تعلقات کا اجتماعی روپ نہ صرف موجود تھا بلکہ وہ ہر مرحلۂ انقلاب میں مرکز و محور کی حیثیت رکھتا تھا جہاں مر دوزن دونوں نے مل کر ایک صالح اور منظم معاشرہ تشکیل دیا۔ تاہم یہ باہم تعلق اور سماجی اشتراک محض جذبۂ اخوت کا بے لگام اظہار نہ تھا، بلکہ اس کے دامن میں شعورِ حدود، وقارِ فطرت اور شرعی توازن کی گرہیں بڑی حکمت سے باندھی گئی تھیں۔ مر دوزن کے اختلاط کو ایک ایسے ضابطے میں ڈھالا گیا جو نہ صرف فرد کی عصمت کا نگہبان تھا، بلکہ معاشرت کے وقار کا محافظ بھی۔

وہ اصول و قواعد جو اس معاشرے میں کار فرما تھے حسب ذیل ہیں:

- مر دو عورت دونوں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینا ضروری ہے، جس سے ذاتی عزت اور احترام کی حفاظت ہوتی تھی[۵]۔
- معاشرت میں اخلاقی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے مر د وزن دونوں سے نگاہوں کو پست رکھنے کی ہدایت کی گئی تا کہ کسی کی ذاتی حدود میں مداخلت نہ ہو[۶]۔
- شرم گاہ کی حفاظت کا حکم دیا گیا۔ اس ہدایت نے فرد کی اخلاقی حدود کو واضح کیا، تا کہ گناہ اور فساد سے بچا جا سکے اور معاشرت میں استحکام پیدا ہو[۷]۔
- اجنبی مر د و عورت کو اکیلے میں ملاقات سے روکا گیا تا کہ معاشرت میں فطری تحفظ اور اخلاقی نظم قائم رہے[۸]۔
- جب افراد ساتر لباس میں ہوں اور ملاقات میں کئی لوگ موجود ہوں تو میل جول کی اجازت دی گئی تا کہ معاشرت میں شائستگی برقرار رہ سکے۔ قرآن میں حکم دیا گیا: وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ...[۹]

---

(۵) سورہ النور، آیت نمبر ۲۷

(۶) ماخذ سابق، آیت نمبر ۳۰، ۳۱

(۷) سورہ المومنون، آیت نمبر ۵

(۸) صحیح البخاري، کتاب النکاح، باب ماینھی من الدخول علی المغیبات، حدیث: ۵۲۳۳۔

(۹) سورہ الاحزاب، آیت نمبر ۵۳

یہ حکم اگرچہ امہات المؤمنین کے لیے خاص ہے، مگر اصولاً تمام مومنین و مومنات کے لیے پردے کے اہتمام کے ساتھ، شائستہ انداز میں، ضرورت کے تحت میل جول کی اجازت کو بیان کرتا ہے:

- شوہر کی غیر موجودگی میں کسی مرد کا گھر میں داخلہ منع تھا، تاکہ عورتوں کی عزت و عفت کا تحفظ ہو[۱۰]۔
- مذہبی اجتماعات اور عبادات میں مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ صفیں مخصوص کی گئیں تاکہ ہر شخص اپنی عبادت میں خلل سے بچ سکے، مگر اس کے باوجود ایک دوسرے سے تعلیم و تربیت اور مشاورت کا عمل جاری رکھا گیا[۱۱]۔
- مردوزن کو غیر ضروری تعلقات اور میل جول سے بچنے کی ہدایت دی گئی تاکہ معاشرتی فساد اور فتنہ سے بچا جاسکے[۱۲]۔ یہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اخلاقی حدود کو برقرار رکھنا اور غیر ضروری تعلقات سے اجتناب ضروری ہے۔

یہ تمام گائیڈ لائنز ایک اعلیٰ سطح کی فکری بصیرت کی عکاسی کرتی ہیں جو ایک طرف فرد کی ذاتی آزادی کو تسلیم کرتی ہیں اور دوسری طرف ان آزادیوں کے اندر حدود اور ضوابط کا احترام کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ ان اصولوں نے خواتین کو اس بات کا اختیار دیا کہ وہ اپنے گھروں سے باہر نکل کر معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لیں، مگر اس میں ان کی عزت و تکریم اور فطری حقوق کا مکمل تحفظ بھی کیا گیا تھا۔ یعنی، ان گائیڈ لائنز نے معاشرتی تعلقات کی تشکیل میں ایسے توازن کی فضا پیدا کی جہاں نہ صرف مردوں اور عورتوں کو ان کے حقوق کا پورا احترام حاصل تھا، بلکہ ان کے تعلقات میں اخلاقی، روحانی اور سماجی اقدار کا تحفظ بھی یقینی بنایا گیا تھا۔

مختصراً عہدِ نبویؐ کے معاشرتی تعلقات کا مطالعہ ہمیں اس حقیقت تک لے جاتا ہے کہ اسلام کی روح نہ صرف عبادات میں توازن پیدا کرتی ہے بلکہ معاشرت میں بھی عدل، توازن اور وقار کو بنیاد بناتی ہے۔ مردوزن کا تعلق، جسے اکثر یا تو افراط کی نذر کر دیا جاتا ہے یا تفریط کے اندھیروں میں

(۱۰) صحیح البخاري، کتاب النکاح، باب لایخلون رجل بامرأة إلا ذو محرم...، حدیث نمبر: ۵۲۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الخلوة بالأجنبیة والدخول علیها، حدیث: ۲۱۷۲۔

(۱۱) صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب انصراف النساء قبل الرجال من الصبح، حدیث نمبر: ۸۷۰۔

(۱۲) صحیح البخاري، کتاب النکاح، باب لایخلون رجل بامرأة إلا ذو محرم...، حدیث نمبر: ۵۲۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الخلوة بالأجنبیة والدخول علیها]، حدیث: ۲۱۷۲

گم کر دیا جاتا ہے، وہ نبوی حکمت میں ایک متوازن اور فطری ڈھانچے میں سامنے آتا ہے۔ یہ تعلق نہ بے لگام آزادی پر مبنی تھا اور نہ ہی جبر و تفریق پر، بلکہ ایک ایسی روشنی پر قائم تھا جو احترام، ذمہ داری اور باہمی وقار کی شمع سے فروزاں تھی۔ معاشرتی زندگی کے اس نبوی نمونے میں تعلیم، تجارت، مشاورت، عبادت، ہجرت، خدمتِ خلق اور حتیٰ کہ سماجی بحرانوں کے لمحوں میں بھی مرد وزن نے ایک دوسرے کے ساتھ ایک باوقار اور ہم آہنگ کردار ادا کیا۔ ان کے بیچ حائل حدود، رکاوٹیں نہیں بلکہ ضوابط تھیں؛ جو ان کے تعلق کو محفوظ بھی کرتی تھیں۔

یہ سادہ، مگر عمیق حقیقت سمجھنے کی ہے کہ عہدِ نبوی کا معاشرتی نظام کوئی وقتی ضرورت نہیں بلکہ ایک دائمی حکمت کا مظہر تھا۔ اس میں نہ صرف اخلاقی تربیت کا عنصر موجود تھا بلکہ سماجی شعور، فطری جبلّتوں کی تطہیر، اور روحانی ہم آہنگی کی ایک لطیف ترتیب بھی تھی۔ آج کے پیچیدہ معاشروں میں، جہاں فردیت اور آزادی کی آوازیں شور بن کر تعلقات کی اصل روح کو دبا رہی ہیں، وہاں عہدِ نبوی کی یہ حکیمانہ ترتیب ایک رہنما روشنی بن سکتی ہے — ایک ایسی روشنی جو ہمیں سکھاتی ہے کہ تعلق کا مفہوم جسم کی قربت سے زیادہ روح کی ہم آہنگی، عقل کی حکمت اور دل کی شرافت میں ہے۔ پس، مرد وزن کے درمیان معاشرتی تعلقات کا یہ نبوی خاکہ محض ایک تاریخی تجربہ نہیں بلکہ ایک فکری واخلاقی میراث ہے — ایسی میراث جو اگر سمجھ لی جائے تو نہ صرف ہمارے سماج کو سنوار سکتی ہے، بلکہ ہمارے وجود کو بھی وہ وقار اور توازن عطا کر سکتی ہے جس کی تلاش میں آج کا انسان سرگرداں ہے۔

کتابیات

۱۔ القرآن الکریم

۲۔ امام محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح (صحیح البخاری)، تحقیق: محمد زہیر بن ناصر الناصر، بیروت: دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ

۳۔ امام مسلم بن الحجاج۔ الجامع الصحیح (صحیح مسلم)، تحقیق: محمد فؤاد عبد الباقی، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۵ھ

۴۔ مام احمد بن یحیی بن جابر البلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: الدکتور ریاض زرکلی، سہیل زکار، دار الفکر للطباعہ والنشر والتوزیع، بیروت، ۱۹۹۶

۵۔ عبد الملک ابن ہشام، السیرہ النبویہ، اردو ترجمہ: سید یسین علی دہلوی، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۹۴، جلد اول۔

۶۔ عز الدین ابن الاثیر، اسد الغابہ فی معرفہ الصحابہ، دار الفکر للطباعہ والنشر والتوزیع، بیروت، ب۔ت۔

۷۔ امام ابن حجر العسقلانی،، فتح الباری فی شرح البخاری،، مکتبۃ دار السلام، ریاض، ۱۹۹۷

۸۔ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۶

۹۔ سید ممتاز علی، حقوق نسواں، مطبع رفاہ عام لاہور، ۱۸۹۸

۱۰۔ اشرف علی تھانوی، خطبات حکیم الامت، ادارہ تالیفات اشرفیہ پاکستان، ۱۴۲۹ھ

۱۱۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودی، پردہ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دلی، ۱۹۹۳

۱۲۔ قاری محمد طیب، شرعی پردہ، ادارہ اسلامیات لاہور، ب۔ت۔

۱۳۔ ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی، نبی اکرم اور خواتین ایک سماجی مطالعہ، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۲۰۰۸

عہدِ وسطیٰ کے ممتاز دہلوی صوفی شعراء

ڈاکٹر محمد احمد نعیمی

اسسٹنٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

manaeemi@jamiahamdard.ac.in

وطن عزیز ہندوستان گنگا جمنی تہذیب اور عقیدت و محبت کی سرزمین ہے۔ اس کے ذرّہ ذرہ میں کچھ ایسی مقناطیسی قوت رہی ہے کہ دنیا کی قومیں اور مذہبی اکائیاں اس کی طرف شروع سے ہی متوجہ رہی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ہمارا یہ عزیز ملک نہ صرف ہمیشہ انسانیت و مروت کا مرکز بنا رہا بلکہ اس کا سماجی ماحول اور معاشرتی زندگی گوناگوں مذہبی و روحانی اثرات سے معمور رہا۔ علم سماجیات کا اصول ہے کہ جب دو یا چند عظیم ثقافتیں و تہذیبیں باہم قریب ہوتی ہیں تو ان میں گفت و شنید، نشست و برخاست، تبادلۂ خیالات، باہمی تعلقات و میل جول اور آپسی معاملات و لین دین کی وجہ سے بہت سے اثرات معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ اسی باعث اس وطنِ عزیز میں نت نئے افکار و نظریات نے جنم لیا۔ افکار و نظریات کے اختلاف نے نہ صرف ہندوستانی تہذیب کو عروج بخشا بلکہ مختلف تہذیبوں کے اتصال و ربط کا راستہ ہموار کیا اور ایک دوسرے کے خیالات اور نظریات کو سمجھنے کا بھی موقع فراہم کیا، جس کے نتیجے میں ایک مشترکہ تہذیب کی نشو و نما ہوئی۔

مشترکہ تہذیب ہندوستان کی ایک امتیازی شان ہے جس کی نشو و نما میں صوفیاء کرام، علماء عظام اور مختلف مذاہب کے سادھوؤں، سنتوں اور دھرم گروؤں کا اہم کردار رہا ہے۔ اپنے خیالات اور تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے نہ صرف انھوں نے رواداری و امن و آشتی کا طریقہ اختیار کیا بلکہ عوام کے قلوب تک پہنچنے کے لیے انھیں کی زبان استعمال کی کیونکہ عوام کو متاثر کرنے اور ان کو قریب کرنے کے لیے ان ہی کی زبان میں گفتگو کرنا ضروری ہے۔ اسی کے بعد ایک دوسرے کے خیالات و نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے تبلیغ و تعلیم کے لیے انھوں نے جہاں دیگر اصول و طریقے اپنائے وہاں اس علاقہ کی رائج زبانوں پر دسترس حاصل کی تاکہ بحسن و خوبی اپنا

پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ اشاعتِ اسلام کی ہندوستانی تاریخ شاہد ہے کہ جو بھی صوفیاء اور علماء سرزمینِ ہندوستان میں دیگر ممالک سے تشریف لائے یا ہندوستان میں پیدا ہوئے وہ متبحر عالم وفاضل اور مفتی ہونے کے ساتھ مقامی زبانوں کے بھی عالم و متکلم ہوتے تھے اور عوام سے انھیں کی مادری و علاقائی زبان میں گفتگو اور تبلیغ وتعلیم فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (۹۷۳-۱۰۵۰ء) مایہ ناز اسلامی محقق وعالم ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو دھرم اور سنسکرت کے عظیم اسکالر تھے جن کو اہلِ علم و دانش ہندو دھرم کے حوالے سے بھی ایک مستند و متبحر عالم کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اور آپ کی شاہکار تصنیف "تحقیق ما للہند من مقولۃ" ہندو دھرم کے بارے میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سلطان بلبن کے دور میں مشہور صوفی بزرگ اور اولیاء اللہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ بہاء الدین، شیخ بدرالدین اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جیسے اکابر ہوئے جن کے کلام میں ہندی شاعری کے اثرات موجود ہیں۔ جلال الدین خلجی کے عہد میں مشہور صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء گزرے ہیں جن کی ہندی نگارشات ملتی ہیں اورحضرت امیر خسرو (۱۲۵۳- ۱۳۲۵ء) کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ یہ نظام الدین اولیاء کے شاگرد رشید و مرید خاص تھے اور علاء الدین خلجی کے دربار میں ماہر موسیقی کی حیثیت سے وابستہ تھے۔[۱]

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱-۱۴۲۲ء) دکن کے عظیم صوفی عالم ہیں۔ گلبرگہ کرناٹک میں آپ کی عظیم الشان خانقاہ و مزار ہے۔ آپ نے اپنے دور میں ہندوؤں کے فرضی قصوں کو مسلمانوں کی اخلاقی تعلیم کے لیے مثالی طور پر استعمال کیا ہے۔ حضرت شیخ محب اللہ الٰہ آبادی (۱۵۸۷-۱۶۴۸ء) سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ گزرے تھے جو ہندو مذہب کی معلومات سے دلچسپی رکھتے تھے اور سنسکرت کے بھی بڑے عالم تھے اور ان کی اس سلسلے میں تصانیف پائی جاتی ہیں۔[۲]

---

[۱] محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مکتبہ کلیان، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء ص ۱۴۴؛ سید صباح الدین عبد الرحمن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۳ء، ص ۶۰۔

[۲] ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص ۱۹، ڈاکٹر محمد عمر، نشریات حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء؛ عماد الحسن آزاد فاروقی، ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۵۳، ۵۷۔

مسلم علماء، صوفیاءاور شعراء کا ہندوستانی تہذیب وثقافت اور لسانی ادب سے یہ شغف اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ حضرات کسی زبان کے مخالف نہ تھے۔ وہ مختلف علاقوں اور بستیوں اور ان کی زبانوں سے ویساہی تعلق رکھتے تھے جیسے اپنی مادری زبان سے۔ مسلم علما و صوفیا جہاں جہاں پہنچے انھوں نے علاقائی یا مقامی زبان اور ان کے خیال و ادب کو اپنے سانچے میں ڈھالنے اور اپنانے کا رویہ اختیار کیا۔ رواداری کے اس پہلو کے پیشِ نظر مسلم علماء نے سنسکرت زبان بھی سیکھی۔ اس حوالے سے البیرونی، داراشکوہ، عبدالرحیم خان خاناں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ نیز مسلم حکمرانوں نے سنسکرت کی سرپرستی بھی کی۔ اس کے بعد جب ہندی کا رواج بڑھا تو اس زبان کی خصوصیات کے تحت اس کو بھی مکمل طور پر قبول کیا۔ چنانچہ ترکی، فارسی اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور ان کا شعری و نثری سرمایہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فارسی بولی آئینہ ترکی ڈھونڈھی، پائی نا
ہندی بولی آرسی آئے خسرو کہے کوئی نہ بتائے[۳]

صوفی شاعر ملک محمد جائسی نے بھی اس کو خوب فروغ بخشا۔ وہ کہتے ہیں:

ترکی، عربی، ہندوی بھاشا جیتی آنہی
جیہہ منہہ مارگ پریم کا سبے سراہیں تانہی[۴]

بابافرید الدین گنج شکر (م: ۶۶۴ھ) کہتے ہیں:

جوبن جائے تو جائے، پرپیا کی پیت نہ جائے دیکھ سکی جوبن کتنے، بن پریت کے کمہلائے

بو علی شاہ قلندر پانی پتی (م: ۷۲۴ھ) فرماتے ہیں:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے[۵]

---

(۳) برج رتن داس، امیر خسرو کی ہندی کویتا، ناگری پرچارنی سبھا، کاشی، ۲۰۱۰ بکرمی، ص ۲۰

(۴) رام چندر شکلا جائسی گرنتھاولی، پدماوت، اکھراوٹ، آخری کلام، ناگری پرچارنی سبھا، کاشی، ۲۰۱۷ بکرمی، ص ۳۰۱

(۵) سیدہ جعفر، گیان چند، تاریخ ادب اردو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، جلد ۱، ص ۳۷۷، ۳۸۳

مختصر یہ کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ بالخصوص شہر دہلی میں طبقۂ صوفیاء و علماء میں ایسے نفوس ایک اچھی تعداد میں رہے ہیں جن کو شعر وسخن سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں نعتیں، منقبتیں، غزلیں، نظمیں، رباعیات، قطعات، گیت، چھند اور دوہے وغیرہ لکھے جن کے ذریعے وہ نبیٔ اکرم ﷺ کی بارگاہِ اقدس اور بزرگ اکابرین کے دربار پر وقار میں نذرانۂ عقیدت، فلسفۂ تصوف اور تعلیمات طریقت پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس کو نہ صرف خیر وبرکت اور نجات و مغفرت کا ذریعہ تصور کرتے تھے بلکہ اسلامی تعلیمات اور پیغامِ رسالت ﷺ کو امتِ اجابت و دعوت تک پہنچانے کا طریقہ سمجھتے تھے۔ ہندوستانی تاریخ اور ہندوستانی ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفی شعرا نے قدیم ہندوستانی شعر وادب کی اہمیت کو بحسن وخوبی جانا پہچانا اور اپنی ادبی تخلیقات سے اس کے حسن کو مزید دوبالا کیا۔

جن صوفی شعرا وادبا نے اپنی منثور یا منظوم تخلیقات سے شعر وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ہر ایک کا بالتفصیل یا بطور اختصار تذکرہ کرنا ایک تحقیقی مقالہ کا متقاضی ہے۔ ان میں سے چند ممتاز صوفی شعرا کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

حضرت بو علی شاہ قلندر، حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی، حضرت امیر خسرو، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت امیرحسن علا سجزی، حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت سرمد کاشانی، حضرت مظہرِ جانِ جاناں، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت خواجہ میر درد، عبد الرحمن احسان دہلوی اور شاہ نصیر دہلوی وغیرہ۔

مذکورہ بالا صوفی شعرا کی شعر وسخن کے حوالہ سے پیش کی گئیں خدمات کا اجمالی جائزہ لینے کے لیے ایک طویل مقالے کی ضرورت ہے لہٰذا آئندہ سطور میں ہم صرف چند ممتاز دہلوی صوفی شعرا کی شعری وادبی خدمات کا اجمالی خاکہ پیش کر رہے ہیں۔

حضرت بو علی شاہ قلندر (۱۲۰۹- ۱۳۲۴ھ) عالمِ اسلام کے مشہور صوفی اور خواجہ نظام الدین اولیا و حضرت امیر خسرو کے ہم عصر وصاحب علم و صاحب کرامت بزرگ تھے۔ برّ صغیر ہند وپاک کے مشہور و معروف اولیاء کرام اور سلسلۂ چشت کے عظیم مجاذیب و قائدین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ دہلی کے حکمراں علاء الدین خلجی اور جلال الدین خلجی بھی آپ کے حلقۂ مریدین میں داخل تھے۔ آپ علوم شریعت اور علوم معرفت وطریقت کی طرح علوم و شعر وادب میں بھی

یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ مثنوی بو علی قلندر رموزِ توحید اور معارف و طریقت کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ اسی طرح فارسی زبان میں دیوانِ شرف الدین بو علی قلندر تصوف کے موضوع پر انتہائی اہم کتاب ہے۔ علاوہ ازیں حمد، نعت، رباعیات، غزل اور دوسری اصنافِ سخن پر مشتمل آپ کا بہت سا کلام موجود ہے۔ آپ کے روحانی و عرفانی کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

مے زنم فاش در تصورِ او نعرۂ لا الٰہ الاّ ہو
عاشقاں سجدۂ مے کنند او را ہر کہ از خونِ دل کنند وضو

(میں اس کے تصور میں لا الٰہ الاّ ہو کا نعرہ مارتا ہوں۔ اس کو وہ عاشق سجدہ کرتے ہیں جو خونِ دل سے وضو کرتے ہیں)

منم محو جمال او نمی دانم کجا رفتم شدم غرق وصال او نمی دانم کجا رفتم

(میں اس کے جمال میں محو ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں گیا، میں اس کے وصال میں غرق ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں گیا)

غلام روئے او بودم، اسیر موئے او بودم غبار کوئے او بودم، نمی دانم کجا رفتم

(میں اس کے رخ روشن کا غلام ہوں اور اس کی زلفوں کا اسیر ہوں، میں اس کی گلیوں کی دھول ہوں مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں گیا)

قلندرؔ بو علی ہستم بہ نام دوست سر مستم دل اندر عشق او بستم نمی دانم کجا رفتم

(میں بو علی قلندر ہوں اور دوست کے نام میں مگن ہوں، میرا دل اس کے عشق میں مست ہے، مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں گیا)

گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے چندیں سخنِ لغز کہ گفتے کہ شنودے

(اگر عشق اور غمِ عشق نہ ہوتا تو ایسی پیچیدہ باتیں کون کہتا اور کون سنتا، یعنی کوئی خدا تک نہ پہنچتا اور حسنِ ازلی چہرے سے پردہ نہ اٹھاتا)

اے ثنائت رحمۃ للعالمیں یک گدائے فیضِ تو روح الأمیں

(یارسول اللہ! آپ کی تعریف و توصیف میں رحمۃ للعالمین آیا ہے اور جبرئیل امین آپ کے فیض کا ایک گدا ہے)

اے آں کہ بفرقت زلعمرک بود اِکلیل وے بر درِ تو ناصیہ سا آمدہ جبرئیل

(قسم ہے آپ کی حیاتِ طیبہ کی اے محمد ﷺ کہ جبرئیل امین فرشتوں کا سرتاج تیری فرقت میں پیشانی کے بل تیرے حضور آیا ہے)

ایوانِ تو عرش است کہ در جلوہ دراری انوارِ تو اش بر در و دیوار چو قندیل

(آپ کا ایوان عرش ہے اور آپ جلوے میں روشن ستارہ۔ آپ کے انوار در و دیوار پر قندیل کی طرح ہیں)[۲]

حضرت نظام الدین اولیا، محبوبِ الٰہی (۱۲۳۸-۱۳۲۵ھ) اللہ کے ولی، ممتاز صوفی، متبحر عالمِ دین، طریقت و معرفت کے عظیم سرخیل اور حضرت امیر خسرو کے پیر و مرشد تھے۔ آپ کا آستانہ آج بھی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صاحبِ دل فقیر کو بھی شعر و سخن سے گہری دلچسپی تھی۔ آپ نے اپنے روحانی خیالات اور قلبی واردات کو انتہائی حسن و خوبصورتی کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ مثلاً آپ کے درج ذیل اشعار دیکھیں:

صبا بسوئے مدینہ رو کن ازیں دعاگو سلام برخواں به گرد شاہ مدینہ گرد و بصد تضرع پیام برخواں

(اے صبا مدینے کا رخ کر اور اس دعاگو کا سلام پہنچا، شہنشاہ مدینہ ﷺ کے روضہ کے گرد گھوم کر انتہائی عاجزی کے ساتھ پیام پہنچا)

بشو ز من صورت مثالی نماز بگذار اندر آنجا به لحن خوش سورۂ محمد تمام اندر قیام برخواں

(میری صورت مثالی اختیار کر کے وہاں نماز ادا کر اور اس نماز میں خوش الحانی کے ساتھ سورۂ محمد ﷺ کی تلاوت کر)

به باب رحمت گہے گزر کن بباب جبریل گہہ جبیں سا سلام ربی علیٰ نبی گہے بباب سلام برخواں

(کبھی باب رحمت سے مسجد نبویؐ میں داخل ہو، کبھی باب جبریل پر سر جھکا، کبھی باب السلام سے اندر جا کر نبیٔ اکرم ﷺ پر میرے رب کا سلام پہنچا)

بنہ بہ چندیں ادب طرازی سر ارادت بخاک آں کو صلوٰۃ وافر بر روح پاک جناب خیر الانام برخواں

(انتہائی ادب کے ساتھ سرِ عقیدت اس کوچے کی خاک پر رکھ کر جناب خیر الانام ﷺ کی روحِ مبارک پر بے انتہا درود سلام پڑھ)

---

[۲] شیخ محمد عطا نظامی و شیخ حبیب اللہ نظامی، مفتاح الغیب، اشرف برقی پریس، سیالکوٹ، ۱۹۳۳ء، ص: ۲۵۵، ۲۷۸، ۲۹۹، ۳۰۳، ۳۱۲؛ حکیم مطیع الرحمٰن، دیوان بو علی شاہ قلندر، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۴ء، ص: ۱۶۴

بہ بزم پیغمبر ایں غزل راز عبد عاجز نظاؔم بر خواں　　بہ لحن داؤد ہم نوا شو بہ نالہ و درد آشنا شو

(لحنِ داؤدی سے ہم آہنگ ہو کر سوزِ دل سے بندۂ عاجز نظام کی طرف سے اس غزل کو رسولِ خدا ﷺ کی مجلس مبارک میں پڑھ کر سنا)۔(۷)

حضرت امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵ھ)، محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کے محبوب مرید صادق، فارسی و اردو کے پسندیدہ صوفی شاعر اور ماہر موسیقی تھے۔ ان کو "طوطیٔ ہند" بھی کہا جاتا ہے۔ خسرو بہت سے علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے لیکن شعر و سخن اور موسیقی کے حوالے سے ان کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ خسرو نے ہر صنف شعر، مثنوی، قصیدہ، غزل، اردو و ہندوی دوہے، پہیلیاں اور گیت وغیرہ میں بے مثال طبع آزمائی کی ہے اور غزلیات کے پانچ دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ دنیا میں اردو کا پہلا شعر امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے اور اردو کے ابتدائی موجدین میں آپ کا نام شامل ہے۔ امیر خسرو موسیقی سے کافی دلچسپی رکھتے تھے مثلاً: ہندوستانی موسیقی کے میدان میں ترانہ، قول اور قلبانہ انھی کی ایجاد ہے۔ بعض ہندوستانی راگنیوں میں ہندوستانی رنگ و ڈھنگ کی بہترین پیوند کاری کی ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے اہم ساز طبلہ اور ستار انھی کی ایجاد مانی جاتی ہے اور فن موسیقی کے اجزا جیسے خیال اور ترانہ بھی انہیں کی ایجاد ہے۔

امیر خسرو نے اپنی شاعری میں فارسی، عربی اور اردو کے الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ اور ہندی اصطلاحات کا منفرد انداز میں استعمال کیا ہے۔ آپ کے کلام میں ہندوستان میں رائج و مستعمل مختلف زبانوں کا ایسا نادر و حسین سنگم نظر آتا ہے کہ اس کی مثال ماضی و حال میں نظر نہیں آتی۔ خالص ہندوستانی رنگ کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

رینی چڑھی رسول کی سو رنگ مولیٰ کے ہاتھ　　جس کے کپرے رنگ دئے سو دھن دھن وا کے بھاگ
خسرو باجی پریم کی میں کھیلوں پی کے سنگ　　جیت گئی تو پیا مورے ہاری پی کے سنگ
گجری کہ تو در حسن و لطافت چو مہی　　آن دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد　　ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی(۸)

---

(۷) قادری، شاہ ہلال احمد، نغمات الانس فی مجالس القدس، خانقاہ مجیبیہ، پٹنہ، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۵۷؛ سید نور الحسن سہسوانی، نغمات سماع، ناشر نامعلوم (بحوالہ ریختہ)، ۱۹۳۵ء، ص: ۲۹۹۔
(۸) گوپی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندوی کلام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

ہندوی زبان کے علاوہ فارسی زبان میں بھی آپ نے بہت اعلیٰ معیار کی شاعری کی ہے۔ مثلاً:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم | بہ ہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم
پری پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے | سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسروؔ | محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم[9]

(مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کونسا مقام تھا جہاں رات کے وقت میں گیا تھا، ہاں اتنا معلوم ہے کہ وہاں ہر طرف جاں نثار عاشقوں کا رقص ہو رہا تھا، رات جہاں میں گیا تھا۔ ایک انتہائی حسین و جمیل، محبوب، دل آویز قد، نور برستا ہوا چہرہ، دلکش مکھڑے والا، وہاں تھا، جہاں رات کے وقت میں گیا تھا۔ اے خسرو! ماحصل یہ کہ وہ مقام لامکاں تھا، خود رب تبارک و تعالیٰ اس محفل کا میر و صدر تھا، اور اس محفل کو منور کرنے والے شمع صفت محمد ﷺ تھے، جہاں رات کے وقت میں گیا تھا۔)

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی (۱۲۷۴-۱۳۵۶ھ): نامِ نامی نصیر الدین، خطاب ''محمود'' اور لقب ''چراغ دہلی'' ہے۔ آپ صوفیٔ باصفا، شیخِ کامل، متبحر عالمِ دین، خواجہ نظام الدین اولیا کے محبوب خلیفۂ صادق تھے۔ اللہ نے آپ کو علومِ ظاہری اور علومِ باطنی دونوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ علومِ شریعت و طریقت کے علاوہ شعر و سخن پر بھی آپ کو خاصی دسترس حاصل تھی۔

شریعت و طریقت کے مطابق خشیت الٰہی، عشقِ الٰہی اور حبِ رسول یا عشقِ رسول ایک مومن صادق کے لئے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بندۂ مومن کو معراجِ ایمانی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کا سینہ عشقِ خدا و عشقِ مصطفی ﷺ کا مخزن و مسکن ہوتا ہے اور یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کے باعث کلام میں روحانی طہارت و لطافت اور قلوب کو منور و مجلیٰ کرنے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ در حقیقت عشقِ خدائے عز و جل اور عشقِ مصطفی ﷺ کا منظوم اظہار ہے جو آپ کے دل میں موجیں مار رہا تھا۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

باکارم و بے کارم چوں مد بہ حساب اندر | گویانم و خاموشم چوں خط بہ کتاب اندر

(میں کار آمد بھی ہوں اور بے کار بھی ہوں، جس طرح شمار میں مد کی حیثیت ہوتی ہے، یعنی مد کو

---

[9] سید نور الحسن سہسوانی، نغمات سماع، ص:۲۸۸،

علیحدہ سے لکھا جائے تو حروف میں اس کا شمار نہیں ہوگا اور حسب ضرورت کسی حرف پر ہو تو بہت کار آمد ہے۔ میں بولتا بھی ہوں اور خاموش بھی جیسے کتاب کی تحریر)

اے زاہد ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی او در من و من در وے چوں بو بگلاب اندر

(اے زاہد ظاہر پرست! تو مجھ سے قرب یعنی حق تعالیٰ کی بات کیا پوچھتا ہے؟ وہ مجھ میں ہے اور میں اس کی ذات میں اس طرح گم ہوں جیسے گلاب کے اندر کی خوشبو، یعنی اللہ سے میرا تعلق ایسا ہی ہے جیسا خوشبو کا گلاب سے۔)

گہ شادم و گہ غمگیں از حال خودم غافل می گریم و می خندم چوں طفل بہ خواب اندر

(میں کبھی خوش ہوں اور کبھی غمزدہ، میں اپنی کیفیت کے ادراک سے خود ہی غافل ہوں، میں روتا بھی ہوں اور ہنستا بھی ہوں، جیسے بچہ نیند کی حالت میں روتا یا ہنستا ہے۔)

در سینہ نصیرؔ الدین جز عشق نمی گنجد ایں طرفہ تماشہ بیں دریا بہ حباب اندر

(نصیر الدین کے سینے میں عشقِ الٰہی کے سوا کسی چیز کی گنجائش نہیں۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ دریا بلبلے میں سما جائے۔ یعنی عشق الٰہی، پانی کی وسعت، جوش اور گہرائی کی بنا پر مثلِ دریا ہے، اور دل مختصر ہونے کی بنا پر مانند بلبلہ ہے)[10]

حضرت امیر حسن علا سجزی (۶۵۴-۷۳۷ھ)، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید و خلیفہ اور ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیا "فوائد الفواد" کے جامع ہیں۔ آپ کا نام حسن، لقب نجم الدین اور تخلص سجزی ہے۔ حضرت امیر حسن علا سجزی نے اللہ ربّ العالمین سے نہایت حساس ذہن اور لطیف ذوق پایا تھا۔ ان کو علومِ عقلیہ و نقلیہ کے علاوہ فارسی اور عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ تیرہ سال کی عمر سے ہی اشعار کہنا شروع کر دیے تھے۔ حضرت امیر خسرو کے ساتھ وہ بھی سلطان غیاث الدین بلبن کے لائق ولی عہد محمد خان شہید کے متوسل رہے جو انہیں دوات دار بنا کر ملتان لے گیا تھا۔ اس کی مصاحبت میں آپ تقریباً پانچ سال تک رہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد جلال الدین خلجی نے انہیں اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا۔

جلال الدین خلجی کے دربار میں گویے امیر حسن کی غزلیں گایا کرتے تھے۔ امیر حسن کا لطافت طبع میں جواب نہ تھا۔ عشق انگیز اشعار کہتے تھے اور ایسے لطائف و نکات ان کے اشعار میں

---

[10] شاہ ہلال احمد قادری، نغمات الانس فی مجالس القدس، ص: ۲۱۵۔

ہوتے تھے کہ بادشاہ اور شاہزادے بھی ان کی باتوں کو سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ آپ کے کلام میں رنگِ تغزل، نغمگی وشیرینی اور فصاحت وبلاغت کا ایسا تنوع موجود ہے جو سامعین کو مسحور کر دیتا ہے۔ شعر وسخن سے ذرا سی بھی واقفیت رکھنے والے قارئین مندرجہ ذیل اشعار سے اس کیفیت کا بحسن وخوبی احساس کر سکتے ہیں:

اے کہ شرح والضحیٰ آمد جمال روئے تو   نکتۂ واللیل وصف زلف عنبر بوئے تو

(اے وہ ذات کہ جس کے رخ روشن کے حسن وجمال کے لئے والضحیٰ کی شرح نازل ہوئی اور آپ کی عنبریں زلفوں کی خوشبو کی تعریف میں واللیل کی آیت نازل ہوئی)

اے دو چشم سرمہ گینت کحل مازاغ البصر   قاب قوسینست رمز گوشۂ ابروئے تو

(آپ ﷺ کی دونوں سرمگیں آنکھوں کا کاجل ہمارے لئے زاغ البصر (آنکھوں کو خیرہ کرنے والا) ہے اور قاب قوسین آپ ﷺ کی ابرو کے گوشے کا اشارہ ہے)

سینۂ دندان تو از یٰسیں نشانے می دہد   سورۂ حٰم دارد حلقۂ گیسوئے تو

(آپ ﷺ کے دندان مبارک کا سینہ سورۂ یٰسین کی نشاندہی کرتا ہے اور آپ ﷺ کے گیسوؤں کا حلقہ سورۂ حٰم ہے)

کعبۂ دل قبلۂ جاں یا رسول اللہ توئی   سجدۂ مسکیں حسنؔ ہر لحظہ بادا سوئے تو

(یارسول اللہ ﷺ آپ ہی میرے دل کا کعبہ اور جان کا قبلہ ہیں۔ اس مسکین حسن کی سجدہ گاہ ہر لمحہ آپ کی ہی جانب ہے)۔

اے طالب فردوس برو سوئے محمد   چوں خلدِ بریں آمدہ در کوئے محمد

(اے جنت کے طلب گارو محمد ﷺ کی طرف دوڑو، اس لیے کہ جنت محمد کی گلی میں ہی ہے)۔

اے کعبہ طلب چند کنی قطع بیاباں   چوں کعبۂ عشاق بود روئے محمد

(اے کعبہ جانے والو! کب تک بیابانوں کا سفر کروگے؟ عاشقوں کا کعبہ توروئے محمد ﷺ ہے)۔

والشمس چہ باشد صفت وجہ شریفش   واللیل چہ باشد صفت موئے محمد

(محمد ﷺ کے چہرۂ مبارک کی صفت والشمس ہے اور موئے محمد ﷺ کی صفت واللیل بیان کی گئی ہے)۔

پند حسنؔ اینست اگر گوش بہ داری اے طالب فردوس برو سوئے محمد

(حسنؔ کی نصیحت کو اگر دھیان سے سنو تو یہی ہے کہ اے جنت کے طلب گارو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑو)۔[11]

حضرت خواجہ باقی باللہ (۱۵۶۳ -۱۶۰۳ء)، سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور صوفی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے پیر و مرشد ہیں۔ آپ کا اصل نام رضی الدین محمد باقی بن قاضی عبد السلام خلجی سمرقندی قریشی تھا لیکن خواجہ بیرنگ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آپ بہترین حافظ قرآن، باعمل وبافضل عالمِ دین، مختلف اسلامی علوم وفنون کے ماہر اور عظیم درویش کامل تھے۔ کثیر علماء ومشائخ اور عامۃ المسلمین کے علاوہ اُمراء سلطنت بھی آپ کے حلقۂ بیعت وارادت میں داخل تھے۔

آپ صاحبِ تصانیف بزرگ ہیں۔ اکثر طلبہ اور مریدوں کو حدیث، تصوف، معرفت وطریقت اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی کلام و فقہ کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ”کلیات باقی باللہ“ آپ کی مشہور کتاب ہے جو کہ آپ کے شعری مجموعۂ کلام، مختلف رسائل، ملفوظات اور مکتوبات پر مشتمل ہے۔ عربی کے علاوہ فارسی زبان وادب اور شعر وسخن پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا بلکہ وہ فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کا حسب ذیل کلام ملاحظہ فرمائیں:

سبحان اللہ زہے خدائے متعال عالی ز تصور و مبرا ز خیال
از نور لطافتش ضمائر مشحون و ز سر سرایتش جہان مالا مال
خواہی کہ جمال غیب در دل یابی زنہار طلب مکن کہ مشکل یابی
در ذات خدا تفکر آمد باطل در فکر چنیں کہ باطل یابی
گرم فیضِ ازل بخشد دل دوست کہ درہم ریزم ایں بتخانہ است
ازیں اقبال یابم احترامے کنم خاصانِ احمد را سلامے
من از خود سیرم اے مقصودِ جانم بروں آگیں غبار از خود فشانم
برم سرمایہ از خلق عظیمت بگیرم قوتِ جاوید از نسیمت[12]

---

[11] ماخذ سابق، ص: ۲۱۵۔

[12] ابو الحسن زید فاروقی، کلیات باقی باللہ یعنی مجموعہ کلام و رسائل و ملفوظات و مکتوبات، ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور، ب۔ت۔ سنہ درج نہیں

(اللہ کے لیے پاکی ہے۔ وہ کیا ہی بزرگ و برتر ہے جو گمان سے بلند اور فکرِ انسانی سے مبرا ہے۔اس کی لطافت و پاکیزگی کے نور سے دلوں کی دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کے اسرارورموز سے دنیامالامال ہے۔اگر تو چاہتا ہے کہ باری تعالیٰ کے جمال کو دل میں پالے، تو فوری طلب مت کر کہ یہ مشکل ہو گا۔خدا کی ذات میں تفکر کو دخل دینا غلط ہے کیوں کہ اس طرح کے غورو فکر سے تجھے باطل حاصل ہو گا۔اگر محبوب میرے دل کو ازل کا فیض بخشے کہ میں اس بت خانے میں بکھرا پڑا ہوں تو میں اس نصیبے سے ایسا احترام پاؤں کہ محمد ﷺ کے خاص لوگوں کو سلام پیش کروں۔اے میری جان کے مطلوب، میں خود سے سیر ہوں، بھرا ہوا غبار خود سے باہر نکال رہا ہوں۔میرے ساتھ تیری عظیم مخلوق کا سرمایہ و دولت ہے، تیری بادِ صبا سے میں ہمیشہ کی قوت حاصل کرتا ہوں۔)

حضرت سرمد کاشانی: جامع مسجد دہلی کے نیچے آرام فرما حضرت سرمد کاشانی (۱۵۹۰ -۱۶۶۱ء)، مختلف گوناگوں صفات و خصوصیات کے حامل تھے جس کی وجہ سے آپ مختلف صفاتی ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ مثلاً: سرمد شہید، شہید عشق اور مجذوب وغیرہ۔ آپ کا وطن کاشان تھا اس لئے کاشانی کہا جاتا ہے اور ''سرمد'' آپ کا تخلص تھا۔

سرمد مشہور حکما ملا صدرا شیر ازی اور ابوالقاسم فندرسکی کے شاگرد تھے، مختلف علوم پر مہارت رکھتے تھے اور فارسی کے ساتھ ساتھ عبری زبان کے بھی عالم تھے۔علاوہ ازیں طبیعت میں شعر وسخن کا ذوق بھی قدرت نے فطری طور پر عطا کیا تھا جس کی وجہ سے اس صنف میں بھی حد درجہ کمال رکھتے تھے۔ آپ کی علمی استعداد وصلاحیت و لیاقت کو سمجھنے کے لئے آپ کی رباعیات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

آپ کی شعر گوئی میں کس طرح کا پروازِ تخیل، فکری کاوش، معنوی ندرت اور اسلوبِ بیان کی جدت ہے اور شعری تلازمات و مناسبات اورادبی اصطلاحات کا آپ نے کس حسن وخوبصورتی سے استعمال کیا ہے، درج ذیل اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

(سرمد غم عشق بوالہوس کو نہ دیا، سوز دل پروانۂ مگس کو نہ دیا، ایک عمر گزرنے ہی پہ ملتا ہے وہ

دوست، یہ وہ شرف ہے جو خار و خس کو نہ دیا)

صد شکر کہ دل دار ز من خوشنود است ہر دم بہ کرم ہر نفسے در جود است

نقصان بہ من از مہر و محبت نہ رسید سودا کہ دلم کرد تمامش سود است

(صد شکر کہ دلدار کا مجھ پر ہے کرم، ہر وقت عنایات ہیں، بخشش ہر دم، ہے شوقِ محبّت تو فقط سود ہی سود، اس شوق میں ہرگز نہیں نقصان کا غم)

ہر کس کہ ثبات دہر سنجیدہ بود فصل گل و ایام خزاں دیدہ بود

مائل نشود بہ رنگ و بوئے گل و مل نادیدہ شمارد آنچہ خود دیدہ بود[۱۳]

(جس شخص پہ ظاہر ہے کہ فانی ہے جہاں، جس شخص نے دیکھی ہو بہار اور خزاں، وہ مائل رنگ و بو نہیں ہو سکتا، نادیدہ ہی سمجھے گا وہ گلزارِ جہاں)

حضرت مرزا مظہرِ جانِ جاناں: دہلی کے صوفیاء کرام میں مرزا مظہر جان جاناں (۱۶۹۹-۱۷۸۱ء) خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ ایک طرف سلسلۂ نقشبندیہ و مجددیہ کے مشہور و معروف بزرگ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں تو دوسری طرف ایک ممتاز صوفی شاعر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کا اصل نام شمس الدین حبیب اللہ اور تخلص مظہر ہے۔ آپ کو علومِ عقلیہ یعنی علمِ قرأت، علمِ حدیث، علمِ تفسیر اور علمِ فقہ کے علاوہ دیگر فنون میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ فن سپہ گری میں آپ کو اس قدر مہارت حاصل تھی کہ فرماتے تھے کہ ”اگر بیس آدمی تلواریں کھینچ کر مجھ پر حملہ کریں اور میرے پاس ہاتھ میں صرف ایک لاٹھی ہو تو ایک آدمی بھی مجھے زخم نہیں پہنچا سکتا“۔

مرزا مظہر جان جاناں صرف اصلاح پسند صوفیٔ باصفا ہی نہ تھے بلکہ عشق حقیقی کے راہی وسالک، فارسی انشا و شاعری میں بلند مقام کے مالک اور اردو زبان کے مصلح اور مجدد بھی تھے۔ اردو کی صوفیانہ شاعری میں جو چند نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ان میں خواجہ میر درد دہلوی، غلام حسن ملتانی، خواجہ رکن الدین عشق، شاہ نیاز احمد بریلوی اور مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہ شعراء جو جمالیات ذوق و شوق کی شاعری کرتے ہیں اور زبان بھی ایسی عام فہم

---

(۱۳) سرمد شہید، رباعیات سرمد، انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۱۸

استعمال کرتے ہیں کہ وہ ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آجائے۔ مثلاً یہ اشعار[۱۴] ملاحظہ فرمائیں:

خدا در انتظار حمد ما نیست محمد چشم بر راہ ثنا نیست
خدا مدح آفریں مصطفیٰ بس محمد حامد حمد خدا بس

(نہ اللہ تعالیٰ ہماری حمد و تعریف کا منتظر ہے، نہ ہی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تعریف و توصیف کے متمنی ہیں۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مدح سرائی کے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کافی ہیں)۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را
بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے کہ ایں مقتول راجز بیگناہی نیست تقصیرے[۱۵]

(خون اور خاک میں تڑپنے والی اچھی رسم کی اُنہوں نے بنیاد ڈال دی، خدا اِن پاک طینت، نیک فطرت عاشقوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ میری قبر کے کتبے پر یہ غیب سے لکھ دیا گیا ہے کہ اس مقتول کا بے گناہی کے علاوہ اور کوئی قصور نہیں)۔

مرزا مظہرِ جانِ جاناں جیسے صاحبِ دل فقیر نے فارسی کے علاوہ اردو یعنی خالص ہندوستانی رنگ و آہنگ میں بھی اپنے روحانی خیالات اور قلبی واردات کی ترجمانی کی ہے۔ مثلاً:

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کف پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انہوں کی نیند کیوں جاتی[۱۶]

حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء)، برصغیر کے ممتاز و معروف عالمِ دین، حافظِ قرآن، الٰہیات داں، فلسفی، منطقی، محدث، مفسر اور صوفی تھے۔ آپ کا اصل نام "ولی اللہ" اور تخلص "امین" ہے۔ آپ طریقت و تصوف کے نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے۔ آپ نے قرآن پاک کا فارسی میں

---

[۱۴] یہ مرزا مظہر جان جاناں کی مشہور نظم کے اشعار ہیں۔
[۱۵] یہ بھی مرزا مظہر جان جاناں کے مشہور اشعار میں سے ہے۔
[۱۶] قریشی، عبد الرزاق، میرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۷۸، ۱۹۵

ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ علم تفسیر،علم حدیث،علم فقہ،علم تاریخ اور تصوف پر بھی کتابیں لکھیں ہیں مگر سب سے زیادہ شہرت آپ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کو حاصل ہوئی۔شاہ ولی اللہ نے بحیثیت داعی بھی بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔حکمت و دانائی کے ساتھ سماج سے برائیوں اور معاشرے میں پھیلنے والی غلط فہمیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھی آپ نے بہترین خدمات انجام دیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی شعر وسخن سے بھی خاصا لگاؤ رکھتے تھے۔کیوں کہ شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں انسان اپنے اندرونی جذبات اور مافی الضمیر کو نہ صرف منظوم سانچے میں ڈھالتا ہے بلکہ سمندر کو کوزے میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔آپ نے بشکل اشعار کس طرح گوہر افشانی کی ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

من نہ دانم بادہ ام یا بادہ را پیمانہ ام عاشق شوریدہ ام یا عشق با جانانہ ام
مبتلائے حیرتم جاں گویمت یا جان جاں اصطلاح شوق بسیار است و من دیوانہ ام
میل ہر عنصر بود سوئے مقرِّ اصلیش جذبۂ اصل ست سرِّ سوزِشِ مستانہ ام
شوق موسیٰ در ظہور آورد نارِ طور را در نہاد شمع آتش می زند پروانہ ام
اے امینؔ بر مستیم نام تجدد تہمت است در ازل پیش از زماں تعمیر شد میخانہ ام[۱۷]

(میں نہیں جانتا کہ میں خود مے ہوں یا مے کا پیمانہ ہوں۔میں ایک حیران عاشق ہوں یا اپنے محبوب سے عشق کرتا ہوں۔میں حیرت میں مبتلا ہوں کہ تجھے جان کہوں یا جانِ جاناں۔شوق کی اصطلاح میں بسا ہوا ہوں اور میں دیوانہ ہوں۔ہر عنصر یعنی ہر عاشق کی خواہش اس کے اصل کی وجہ سے ہے ، میں جلتے ہوئے احساس کی اصل کشش میں مستانہ ہوں۔طور کی آگ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شوق باہر لے آیا۔شمع کی طبیعت میں ہے پروانے کو جلا دینا اور میں وہ پروانہ ہوں۔اے امینؔ میری مستی پر جدت کا نام تہمت ہے،زمانے سے پہلے ازل میں جو میخانہ تعمیر ہوا میں وہی میخانہ ہوں۔)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ مطابق ۱۷۴۶-۱۸۲۳ء) کا اصل نام عبد العزیز اور تاریخی نام غلام حلیم ہے۔آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندِ اکبر

[۱۷] ظہور الحسن شارب، دلی کے بائیس خواجہ، زاویہ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۲۴۵-۲۴۶

اور سراج الہند کے لقب سے مشہور تھے اور مستند و معتمد فقیہ و مجتہد اور ممتاز مفسر و محدث کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کو خاتم المفسرین اور امام المحدثین بھی کہا جاتا ہے۔ نیز آپ کو فنونِ عقلیہ اور علومِ متداولہ اور غیر متداولہ پر اعلیٰ درجے کا عبور حاصل تھا۔ وعظ و ارشاد، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ حدیثِ نبوی ﷺ کا جو شجر آپ کے والد محترم نے ہندوستان میں لگایا تھا، آپ نے اس کو پروان چڑھایا۔ آپ کے بہت شاگرد تھے، جن کا اکابر و ممتاز علما، فضلا، فقہا، محدثین و مفسرین میں شمار ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی شاعر بھی تھے۔ شعر و سخن کا ذوق فطری طور پر آپ کے اندر موجود تھا جیسا کہ آپ کے حسبِ ذیل اشعار سے مترشح ہے:

گر بگلشن بگذری گل بر رخت مفتوں شود ور نمائی قامتِ خود سرو را موزوں شود
کارِ بامعنی است دانا را نہ بانام و نشاں جذبۂ لیلیٰ ندارد بید اگر مجنوں شود
مردِ مفلس را جہاں یک سر محلِّ آفت است شیشہ چوں خالی است گر بادش رسد واژوں شود

(اگر تو چمن سے گزرے تو پھول تیرے چہرے پر فریفتہ ہو جائے، اور اگر تو اپنی قامت سرو (کے درخت) کو دکھادے تو وہ موزوں ہو جائے۔ عقل مند کے لیے نام و نشان کے ساتھ رہنا بامعنی کام نہیں ہے، بید (درخت) اگر مشابۂ مجنوں ہو جائے تو اس سے اس کے اندر جذبۂ لیلیٰ پیدا نہیں ہو جائے گا۔ مفلس و محتاج آدمی کے لیے یہ دنیا سراسر آفت ہے، شیشہ اگر خالی ہو، تو اس کو ہوا بھی لگے تو وہ اُلٹ جاتا ہے۔)

فارسی کلام کے علاوہ عربی زبان میں آپ نے رحمت عالم ﷺ کی شانِ اقدس میں جو رباعی پیش کی ہے آج بھی وہ عوام و خواص میں مقبول ہے:

یا صاحب الجمال و یا سید البشر من وجھک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر[۱۸]

حضرت خواجہ میر درد (۱۷۲۰-۱۷۸۴ء) ایک طرف ممتاز صوفی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں تو دوسری طرف ہندوستانی موسیقی کے گہرے علم کے لئے بھی مشہور ہیں۔ آپ

[۱۸] ظہور الحسن شارب، دلی کے بائیس خواجہ، ص: ۲۵۲-۲۵۵

استاذالشعرا میر تقی میر کے ہم عصر تھے۔ آپ کا اصل نام "خواجہ میر" اور تخلص "درد" ہے۔ آپ کے والد بزرگوار محمد ناصر عندلیب اور عمِ محترم کا بھی فارسی کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا تھا۔

آپ مختلف علوم متداولہ سے واقف و آشنا تھے، بالخصوص تصوف پر آپ کا بہت گہرا مطالعہ تھا اور آپ نے اس کے مختلف موضوعات پر نثر میں کئی رسائل تصنیف فرمائے ہیں۔ آپ اور آپ کے والد محترم دونوں حضرت شاہ گلشن (م:۱۱۵۰ھ) سے نسبتِ بیعت و ارادت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے منظوم کلام میں اکثر تصوف کے مضامین و جلوے نظر آتے ہیں۔ بقول اہل علم ودانش مسائل تصوف، اسرارِ تصوف اور تعلیماتِ تصوف میں ان کے زمانے میں ان سے بڑھ کر اردو میں کوئی شاعر نہیں گزرا۔ ان کے بہت سے اشعار آج بھی زبان زد خاص وعام ہیں۔ مثلاً:

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو — ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں[19]
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑدیں تو فرشتے وضو کریں
وحدت میں تری حرف دوئی کا نہ آسکے — آئینہ کیا مجال تجھے منھ دکھا سکے
روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے — اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا سب — تم رہو خوش ہم تو اپنے گھر چلے[20]

خواجہ میر درد نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور اردو ادب کو فروغ بخشا ہے۔ حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ پر مشتمل آپ کا شعری مجموعہ ودیگر تصانیف آپ کی ادبی خدمات کا منہ بولتا شاہکار ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کا غزلیہ کلام تصوف کا لبادہ اوڑھے نظر آتا ہے۔

کتابیات

محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مکتبہ کلیان، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء۔
سید صباح الدین، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۳ء۔
ڈاکٹر محمد عمر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، نشریات حکومت ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء۔

---

(19) کروبی، جمع کروبیاں: مقرب فرشتہ۔

(20) خواجہ میر درد، دیوانِ درد، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۵۴، ۱۶۱، ۱۸۲، ۱۹۱

فاروقی، عماد الحسن آزاد، ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء۔

داس، برج رتن، امیر خسرو کی ہندی کویتا، ناگری پر چارنی سبھا، کاشی، ۲۰۱۰ بکرمی۔

شکلا، رام چندر، جائسی گر نتھاولی، پدماوت، اکھراوٹ، آخری کلام، ناگری پر چارنی سبھا، کاشی، ۲۰۱۷ بکرمی۔

سیدہ جعفر، گیان چند جین، تاریخ ادب اردو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء

شیخ عطا محمد نظامی و شیخ حبیب اللہ نظامی، مفتاح الغیب (اردو شرح دیوان بو علی شاہ قلندر)، اشرف برقی پریس، سیالکوٹ، ۱۹۳۳ء۔

حکیم مطیع الرحمٰن، دیوان بو علی شاہ قلندر، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۴ء۔

شاہ ہلال احمد قادری، نغمات الانس فی مجالس القدس، دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پٹنہ، ۲۰۱۶ء۔

سید نورالحسن سہسوانی، نغمات سماع، ناشر اور جگہ نامعلوم، ۱۹۳۵ء (ریختہ کی ویب سائٹ پر موجود ہے)

گوپی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندوی کلام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

مولانا ابوالحسن زید فاروقی و ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، کلیات باقی باللہ یعنی مجموعۂ کلام و رسائل و ملفوظات و مکتوبات، ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور سنہ درج نہیں۔

سرمد شہید، رباعیات سرمد، انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز، دہلی، ۱۹۹۲ء۔

عبدالرزاق قریشی، میرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی، ۱۹۷۹ء۔

ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، دلی کے بائیس خواجہ، زاویہ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء۔

خواجہ میر درد، دیوانِ درد، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء۔

فارم IV (رول نمبر ۸)

نام رسالہ : معارف، اعظم گڑھ

نام پریس	:	معارف پریس، اعظم گڑھ	نام پبلشر	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی
مقام اشاعت	:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ	قومیت	:	ہندوستانی
وقفۂ اشاعت	:	ماہانہ	پتہ	:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ
نام پرنٹر	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی	ایڈیٹر	:	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
قومیت	:	ہندوستانی	قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ	پتہ	:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنّفین اعظم گڑھ

میں ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

باب التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر

ششماہی دستک، اردو صحافت نمبر، مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، معاون مدیر، جناب عبدالسمیع

بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے تحقیقی ششماہی رسالہ دستک کے خصوصی شمارے، موضوع کے انتخاب اور پھر متعلقہ مباحث پر اعلیٰ اور نمائندہ مضامین و مقالات کے لحاظ سے اپنی قابل قدر شناخت بنا چکے ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ خانۂ ادب کے ہر مکیں کو اس دستک کا انتظار رہتا ہے۔

۱۳اور ۱۴ یہ دو شمارے ہمارے پیش نظر ہیں۔ شمارہ ۱۳ اردو صحافت نمبر ہے۔ جس میں صحافت کے اصول و ضوابط اور اردو صحافت کی تاریخ اور حال و مستقبل یعنی ابتدا وارتقاء کے اہم مدارج ومنازل جیسے اہم موضوعات کے ذیل میں بنیادی اہمیت کی حامل تحریروں کا انتخاب آگیا ہے۔ صحافت کے اصول و آداب میں خبر، اداریہ، کالم، فیچر، انٹرویو، زبان اور اسلوب کے تعلق سے جو معلومات ہیں وہ فنی لحاظ سے عمومیت کے دائرے میں آتی ہیں، باقی تاریخ وارتقاء کے ذیل میں اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر مباحث نے اس عموم میں خصوص کا رنگ لادیا ہے۔ جو ہندوستان کی اردو صحافت کے ذکر کو نمایاں کرتا ہے لیکن اردو صحافت کے عام مفہوم کے پس منظر کے تقاضوں کے مطابق مرقع کشی میں یک گونہ کمی کا احساس بھی دلاتا ہے اور یہ سوچنے کا موقع دیتا ہے کہ ہندوستان کی اردو صحافت، کا عنوان غالباً زیادہ بہتر ہوتا۔ بہار، جموں کشمیر، جھارکھنڈ، بنارس، لداخ جیسے علاقوں اور مولوی باقر سے کلام حیدری تک موجودہ ہندوستان یا غیر منقسم ہندوستان کے چند مشاہیر صحافت اور ان کی صحافتی خدمات کا عالمانہ و محققانہ جائزہ بہر حال کسی تشنگی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ ایک مضمون اردو کے مستشرقین صحافی کے عنوان سے ہے۔ اس میں ہندوستان کی اردو صحافت سے وابستہ بعض مغربی ملکوں کے صحافیوں کا ذکر ہے۔ اصل لطف تو سرسید، مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد، چراغ حسن حسرت کی تحریروں اور کالموں کی گفتگو میں ہے۔ یہ تحریریں صرف ماضی کی یادگار ہی نہیں، عصر حاضر کی صحافت کے

معیار و وقار کو سنبھالنے اور قوت و توانائی دینے کے لیے آج بھی اپنی اہمیت کا اعلان کرتی نظر آتی ہیں۔

فن صحافت کے اصول و ضوابط کے لئے جن مضامین اور موضوعات کا انتخاب کیا گیا وہ واقعی نظر انتخاب کے حسن کا ثبوت ہے۔ عشرت علی صدیقی مرحوم کی تحریر نے صرف ان ہی کی نہیں، مرحوم قومی آواز کی یادوں کو زندہ کر دیا۔ خبروں کے انتخاب یا ان کی پیش کش میں یہ جملہ بڑے کام کا آگیا کہ اداریے کا کام یہ ہے کہ خبروں اور ان سے پیدا ہونے والے تاثر کو مجموعی طور پر متوازن رکھے، ورنہ جس طرح تیز چاقو سے پھل اور ترکاری کے علاوہ گردن بھی کاٹی جا سکتی ہے اسی طرح اداریے سے فکر میں عدم توازن اور عمل میں بگاڑ بھی آسکتا ہے۔

شافع قدوائی نے خبر کے مفہوم اور تعریف میں اپنے خاص اسلوب میں خبر اور اطلاع کے فرق کی وضاحت میں اپنے مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کا بھی خوبصورت نمونہ پیش کر دیا کہ خبر کے عناصر اور لوازم کیا ہیں، پھر خبروں کی مکانی، قومی، نوعی تقسیمیں کیا کیا ہیں؟ ایسے سوالات کے جوابوں میں علم و آگہی کی نئی آوازوں کی مدد سے نئی پروازوں کو پروان چڑھنے کا حوصلہ بہر حال ملتا ہے۔

عبدالرحمٰن فیصل کی تحریر جو صحافتی بیانیہ، مابعد صداقت اور جھوٹ کی ثقافت کے عنوان سے ہے، وہ ملک بلکہ دنیا کی موجودہ صحافت کی روش، رویہ اور روسیاہی کی سچائی کو صحیح طور پر سمجھنے میں بڑے کام کی ہے۔ مابعد جدیدیت کی طرح مابعد صداقت کی ترکیب میں معنوی وحشت اپنی جگہ لیکن صحافتی بیانیہ میں کوئی پیچیدگی اس لیے نہیں کہ روز مرہ کے واقعات، اگر جھوٹ یا تخیل پر مبنی خبروں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو وہ صحافت کے زمرہ میں شمار کے قابل ہی نہیں۔ موجودہ دور کی عمومی ثقافتی صحافت میں صداقت جس طرح ناکامی کا عنصر بنادی گئی ہے اور موجودہ تکنالوجی کی ترقی میں جس طرح صارفیت کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ جھوٹ اور فریب کا فروغ ہے اور اسی کا نام اکیسویں صدی کی مابعد صداقت صحافت ہے۔ صارف اساس اطلاعاتی تکنالوجی اسی عہد کی دین ہے۔ اس میں صرف سمعی و بصری ذرائع ابلاغ ہی نہیں ترسیلی ذرائع یعنی اخبار و رسائل اب خود ایک حقیقت کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر الفاظ، تصاویر اور متحرک بیانیوں سے باور کراتے ہیں کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ چند ہی اردو والوں کو خبر ہوگی کہ ابھی چند برس پہلے 'مابعد صداقت' کو

آکسفورڈ ڈکشنری نے سب سے بہترین لفظ کے خطاب سے نوازا تھا اور اس کو اصطلاح سے زیادہ سیاست میں بنیادی حیثیت کا اہل قرار دیا تھا۔ 'سیاست مابعد صداقت' کی پہچان اور اب قبولیت اس شکل میں مل گئی کہ سیاست داں عوام سے وعدے یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ یہ پورے ہونے کے لیے نہیں لیکن عوام کو اس کی سچائی پر یقین کر لینا خیال خام اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ مابعد صداقت دنیا میں اس کے سچے ہونے کی توقع کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ صحافیوں، اینکروں اور مباحثوں میں متحرک چہروں اور ان کے نہ تھمنے والے شور میں حقیقت میں موجود واقعہ اور خبر ہی کی زمین پر ایک نئی حقیقت، تشکیل پا جاتی ہے۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور اس سے زیادہ اور نئی نئی ایجادوں نے خبر بنانے، باور کرانے، ذاتی رائے تھوپنے کے ہر جھوٹ کو سچ بنانے پر ایسی قدرت حاصل کر لی ہے جس سے لوگوں کے جذبات متاثر ہوتے اور مشتعل بھی ہوتے ہیں۔

مابعد صداقت خبروں کی دنیا کے لیے پرانی زبان و اصطلاح میں 'دجالی' سے زیادہ مناسب کوئی لفظ نہیں۔ یہ پورا مضمون اس لائق ہے کہ اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً بہ تکرار اس کو چھپنا چاہیے۔

دستک کے ذریعہ اس قسم کی تحریروں کی اشاعت اصلاً ایک سچی اور حقیقی اور بنیادی انسانی اقدار پر مشتمل ثقافت کے احیا اور ارتقا کی قابل قدر کاوش ہے۔ ۲۰۲۳ء اردو صحافت کے دو سو سالہ سفر کی تکمیل کا سال تھا۔ فاضل مدیر نے اس خاص نمبر کے ذریعہ اس کی سالگرہ کا بہترین تحفہ پیش کر دیا۔ ایک صاحب نظر ہی کہہ سکتا ہے کہ ادیب اور صحافی میں جو فرق ہے وہ مقاصد، طرز تحریر اور طرز عمل کے سبب ہے لیکن اردو میں موجودہ عجلت پسند رجحان نے ادب اور صحافت کی حد ہی باقی نہیں رکھی۔ اس اجمال کی تفصیل جس خوبصورت انداز میں کی گئی ہے اس کے لیے کلمات تقدیم میں حروف اعتراف سے روبرو ہونا ہوگا۔ جہاں ادب اور صحافت کے تعلق واشتراک میں نفی واثبات کی بیک وقت موجودگی حاصل جمع کی طرفگی کا احساس دلا جاتی ہے۔ احساس تو یہ بھی فزوں تر ہوتا جاتا ہے کہ دستک محض مجموعۂ مضامین نہیں بلکہ زمانے تک کام آنے والی دستاویز ہے۔ البتہ ادبی صحافت یا اردو صحافت میں زبان و ادب جیسے مضامین میں معارف، برہان، کاروان ادب کا اشارہ تک نہیں، یہ حیرت کی بات بھی نہیں کہ باضابطہ ادبی رسائل کی خودساختہ حدود کے سہارے اس بے ادبی کا شکوہ مدت سے ہے۔ اسلامی علوم میں گویا تحقیق ہے نہ ادب، معارف کی ادبی خدمات

پرڈاکٹریٹ کی سندوں کو بھی ایسے مقالہ نگاروں کی نگاہوں کے دائرے میں جگہ نہیں ملتی۔ دستک کو نظر نہ لگے شاید اسی لیے قریب پونے چار سو صفحات میں چند صفحات ایسے مضامین کے لیے بھی خاص کر دیے گئے۔ دستک کے اس شمارہ کی قیمت ساڑھے تین سو روپے ہے۔ ترسیل زر کے لیے ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف اردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی، وارانسی۔ یوپی ۲۲۱۰۰۵ سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

دستک کا شمارہ نمبر ۱۴ ہندی ادب نمبر کی شکل میں ہے۔ یہ موضوع بھی فاضل مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کی جدت وندرت طبع اور انسانی مطالعات کی وسیع تر تلاش کی شناخت ہی کہا جائے گا۔ ان کی اس سوچ سے اتفاق کرنا ہی چاہیے کہ ملک کی زبان اور اس کے ادب پر ہر شہری کا اسی طرح حق ہے جیسے ملک کے قدرتی اور انسانی وسائل پر ہے۔ ہندی زبان یقیناً ملک کے ایک بڑے خطے کی اکثریتی زبان کے ساتھ پورے ملک کی سرکاری زبان کے درجہ پر فائز ہے۔ اس زبان کو اکثریت اور اقلیت کے خانوں میں مذہبی آئینوں کے ذریعہ دیکھے جانے کی عادت بد، سامراجی ذہنوں کی دین ہے۔ ورنہ ہندی ادب کے بنیاد گزاروں میں قاسم شاہ، جائسی، عبدالرحیم خانخاناں کی وہی اہمیت ہے جو اردو میں ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی اور شاہ حاتم وغیرہ کی ہے۔ گو موجودہ حالات میں یہ محض طوطی کی آواز ہی ہے۔ تاہم اردو والوں کی اعلیٰ ظرفی سے یہ توقع عین حق ہے کہ ہندی زبان کے قدیم و جدید ادب سے ان کی شناسائی ہو اور موجودہ ادبی رجحانات سے واقفیت، خود اردو زبان کی روایتی ہمہ گیری کی توسیع کا ایک جائز ذریعہ بن سکے۔ فاضل مدیر چونکہ زبان وادب کے استاذ ہیں اس لیے ان کا یہ تاثر عملاً بھی درست ہے کہ سیاسی اور تاریخی اسباب کے ذریعہ زبانوں کو مصلحتوں اور مذہبوں کی منفی شناختوں سے دوچار کر دیا گیا۔ جس کے اثر سے اساتذہ اور طلبہ بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ زیر نظر شمارہ اسی احساس کے تحت پیش کیا گیا جس میں ہندی ادب کے ویر گاتھا کال اور بھگتی کال سے جدید ہندی اور دلت ادب تک کی تاریخ آگئی ہے۔ کبیر، رسکھان اور راہل سانکرتیائن سے نرالا، نامور سنگھ اور کملیشور جیسے ہندی ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی، پورے ہندی ادب سے تعارف کی چاہت پوری کر دیتی ہے۔ شاعری، تنقید، ناول اور افسانہ نگاری اور قدیم اور جدید لسانی، شعری اور نثری تغیرات جیسے موضوعات نے اس شمارے کو جامعیت کی

خوبی تو عطا ہی کی ہے۔ ایک انفرادیت کی صفت یہ بھی سامنے کر دیتی ہے کہ لکھنے والوں میں زیادہ تر وہ ہیں جن کی شناخت اردو کے اہل قلم کی ہے۔ ظہیر الدین علوی، یعقوب یاور، فاروق ارگلی، اعظم کریوی، خواجہ وجیہ الدین، مشتاق احمد، وجاہت منظر، خورشید اکرم، عبد السمیع سے طارق چھتاری اور حقانی القاسمی تک کی کاوشیں بجائے خود ثبوت ہیں کہ اردو والوں کی ملک کی تہذیبی و ثقافتی میراث میں کم حصہ داری نہیں۔ فاضل مدیر نے اردو ہندی لسانی اشتراک، خصوصاً صرفی و نحوی اعتبار سے افعال اور ترکیبات کے نظام میں درآمد و برآمد کی مفید روایت کی پاسداری کا ذکر کیا ہے۔ البتہ یہ تاثر کہ اب دونوں زبانوں میں مغائرت اور مخاصمت کی بات پرانی ہو چکی ہے اور یہ کہ دونوں طرف کے اہل قلم نے زبان کے درمیان دیوار نفرت وعداوت کو مسمار کر دیا ہے یہ احساس لاکھ خلوص آمیز ہو لیکن اس کی سچائی کو دل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندی اردو تخلیقات کے تراجم نے آپسی رشتوں کے استحکام کی آس بندھائی ہے۔ ہندی ادب کی بعض اور خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔ ان کا ردو قبول، قاری کے ذوق و مزاج پر منحصر ہے۔ لیکن اس اصول سے کوئی اختلاف نہیں کہ صلاحیتوں کے اختصاص و امتیاز کا ہر دور، مسابقت کی صلاحیت و خصوصیت کا طلب گار ہوتا ہے اپنی صلاحیتوں سے واقف ہونے کے ساتھ مقابل کی طاقت سے باخبر ہونے کی صفت، جذبہ مسابقت کے لیے ناگزیر ہے۔

اکثر مضامین سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ ہندی ادب خصوصاً شاعری، مذہبی تعلیمات و تلمیحات سے لبریز ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی بنیاد سنسکرت ادبیات پر ہے اور یہیں اردو، جڑواں بہن ہوتے ہوئے بھی اس ہندوستانیت کا مظہر بنتی نظر آتی ہے جو مذہبی یا دیومالائی سے پاک ہے۔ لیکن یہ ایک عمومی تاثر ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندی ادب سے تعارف کا ایسا مفصل و مستند وثیقہ اردو میں شاید ہی دستیاب ہو۔ بعض مضامین جیسے دلت خواتین کے مباحث اور ہندی غزل کا سنسار، خوش گوار استعجاب کا سبب بن جاتے ہیں۔ باقی بھار تیندو، نرالا اور جے شنکر پرشاد، نامور سنگھ اور کملیشور اردو والوں کے لیے اتنے ہی معروف اور شاید مقبول ہیں جتنا غالب، سردار جعفری، راہی معصوم رضا ہندی میں ہیں۔ شمارہ ۱۳ کی طرح، صفحات اور قیمت میں دستک کا یہ خاص شمارہ افادیت و جامعیت میں بھی یکساں ہے۔

ماہنامہ اسلامی نقوش، خصوصی اشاعت بہ یاد گار مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی سیتاپوری، مرتب: مفتی محمد خبیر ندوی۔

سیتاپور کے مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی کی زندگی، ان کی تعلیمی و تبلیغی کاوشوں، دارالعلوم دیوبند میں حصول تعلیم اور بعض مشہور دینی درس گاہوں میں تدریسی خدمات اور سب سے بڑھ کر ان کے سلیقۂ خطابت کی حکایتوں پر مشتمل قریب پانسو صفحات پر مشتمل یہ تذکرہ دراصل لائق مرتب کی عقیدت کا نہایت متاثر کن اور دلکش اظہار ہے۔

مولانا قاسمی بظاہر اس شہرت کے قریب نہیں تھے جو بعض اور علما و خطبائے دیوبند کو حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس کتاب سے معلوم ہوا کہ ایک خلقت اس بات پر متفق تھی کہ مولانا قاسمی بے مثال خطیب و معلم تھے۔ دیوبند کی روایات علمیہ کا حصہ بھی ان کو ملا تھا۔ بیضاوی کی شرح بھی کی جو التقریر الحاوی کے نام سے ہے۔ سلم العلوم کی شرح میزان العلوم کے نام سے کی۔ سید قطب شہید کی کتاب التصویر الفنی فی القرآن کا ترجمہ انہوں نے قرآن کریم کے فنی محاسن کے نام سے کیا۔ لیکن ان جھلکیوں سے ان کے علمی کمال اور شخصی جمال کا اصل اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اندازہ تو اس مجموعہ کی کثرت مضامین سے ہوتا ہے۔ عہد حاضر کا شاید ہی کوئی نامور عالم یا استاذ ہو جس کے نام سے یہ مجموعہ خالی ہو۔ ستر سے زیادہ مضامین اور بیس سے زیادہ منظوم تاثرات میں دیوبند، ندوہ، علی گڑھ، سہارن پور اور بستی کے اصحاب علم و فضل شامل ہیں اور سب کی زبان پر مولانا قاسمی کے محاسن کا بیان ہے۔ خراج عقیدت سب سے پہلے مدیر نے پیش کیا۔ لکھا کہ مولانا مرحوم مسلکاً ما انا علیہ واصحابی، مشرباً حنفی دیوبندی، فکراً اعتدال پسند تھے پھر جوش عقیدت میں یہ الفاظ بھی زبان پر آگئے کہ وہ ہر حال میں اپنی برتری، تفوق، بالادستی اور سیادت پسندانہ طبیعت کے واقع ہوئے تھے۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل ڈاکٹر عبید عاصم اقبال کی تحریر سے ہو جاتی ہے۔ مضامین کے عنوانات میں تنوع بھی خوب ہے۔ مست حفیظ رحمانی کا عنوان 'تھا ولی پوشیدہ وہ' اپنے مضمون سے واقعی انصاف کرتا ہے۔ تذکروں کا شوق رکھنے والوں کے لیے اسلامی نقوش کے اس خاص نمبر میں بہت کچھ ہے۔ قیمت سالانہ اور عمومی ۲۵۰۰ روپے ہے۔ پتہ یہ ہے: ماہنامہ اسلامی نقوش، قصبہ تمبور ضلع سیتاپور، یوپی ۲۶۱۲۰۸

سید سلیمان ندوی کا خط
بنام سید ابوالکمال عبدالحکیم دیسنوی

کلیم صفات اصلاحی
رفیق دارالمصنّفین

سید ابوالکمال عبدالحکیم دیسنوی کا وطن دیسنہ ضلع پٹنہ تھا۔ وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے چچا اور علامہ شبلی نعمانیؒ کے دوستوں میں سے تھے۔ قومی کاموں سے بے انتہا دلچسپی لیتے تھے اور مولانا کی تحریکوں کی تائید میں اخبارات میں مضامین لکھتے تھے۔ علامہ شبلی سے ان کے تعلقات کی نوعیت کا مزید اندازہ مکاتیب شبلی حصہ اول میں شامل ان کے نام سات خطوط سے کیا جاسکتا ہے۔

چچا کو سید سلیمان ندوی سے خصوصی تعلق خاطر تھا۔ سید صاحب اپنے علمی، تعلیمی عزائم اور ملی اور قومی کاموں میں ان سے مشورے کرتے تھے۔ اس کا علم ان کے نام سید صاحب کے خطوط سے ہوتا ہے۔ سید صاحب کے سب سے زیادہ مکتوب الیہم میں ان کا نام شامل ہے۔ یہ طویل خط سید صاحب نے اپنے انہی عم محترم کے نام بمبئی سے اس وقت تحریر کیا تھا جب وہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے مدراس جارہے تھے۔ اس خط میں کانفرنس کے ساتھ ساتھ ریاست میسور اور بنگلور کے تقریباً ۱۱۲؍برس قبل کے علمی، تعلیمی حالات اور بعض اہم اور دلچسپ تاریخی و تمدنی تفصیلات آگئی ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ خط دارالمصنّفین کے محفوظہ میں موجود ہے۔

بائی کلہ، پالن جی ہوٹل، بمبئی

عم محترم! تسلیم

میں نے پہلے خط میں آپ کو اطلاع دی تھی کہ مدراس محمڈن کانفرنس کی شرکت کے لیے مدراس جا رہا ہوں۔ ۲۵ء جولائی کو یہاں سے روانہ ہوا اور ۸ء اگست کو واپس آیا۔ یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ مفید و پر از معلومات رہا۔ ۲۵ء کو روانہ ہوا۔ ۲۶ء کو گنڈکل پہنچا، جہاں سے بنگلور (مقام کانفرنس) کو گاڑی جاتی تھی۔ اتفاق سے جس درجہ میں تھا اس میں شوکت علی بھی

تھے۔ کانفرنس، یونیورسٹی، کالج اور اشاعت اسلام پر متفرق گفتگوئیں ہوئیں۔ کانفرنس کے متعلق ہمارے اکثر اعتراضات کو انھوں نے تسلیم کیا۔ یونیورسٹی کے متعلق یقین دلایا کہ گورنمنٹ کو مجبوراً یونیورسٹی کو حق الحاق دینا پڑے گا۔ طرابلس و ایران و مراکو کے حالاتِ بد سے جیسا ہر مسلمان متاثر ہے وہ بھی تھے۔ صبح کو گاڑی بنگلور پہنچی۔ اسٹیشن پر والنٹیر موجود تھے۔

بنگلور ریاست میسور کا بہترین شہر ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے تمام جنوبی ہندوستان میں مشہور۔ آجکل وہاں اچھا خاصا جاڑا تھا اور موسم گرما میں وہاں سردی و گرمی کا اعتدال رہتا ہے۔ غرض یہ کہ وہاں گرمی کبھی نہیں ہوتی۔ اس شہر کا ایک حصہ لشکر گاہ انگریزی ہے اور یہی کانفرنس کا مقام تھا۔ یہ رزیڈنسی ہے۔ دوسرا حصہ شہر ہے جو ریاست کے ماتحت ہے۔ عمارتیں دور دور پست، کھپریل، مگر صاف ستھری ہیں۔ انتظام عمدہ ہے۔ پولیس اچھی ہے۔

نباتات کا ایک عالم یہاں ہے۔ زمین کا رنگ عموماً سرخ ہے اور نہایت زرخیز اور عمدہ ہے۔ سرو، جس کے ایک فرد کا وجود بھی ہمارے باغوں کے لیے باعث سربلندی ہے، یہاں اس کا جنگل ہے۔ میوہ ہر قسم کا یہاں ہوتا ہے۔ انار میں نے یہاں بہت بڑے بڑے دیکھے۔ مدراس میں انگور کے درخت دیکھے۔ سپاری کا درخت دیکھا۔ کھجور کے درخت نہایت کثرت سے ہیں۔

کانفرنس تین دن رہی۔ جسٹس عبدالرحیم پریسیڈنٹ تھے۔ ہندوستان سے تین آدمی شریک تھے۔ میں، خواجہ کمال الدین اور مسٹر شوکت علی۔ کانفرنس کا مقصد جنوبی ہندوستان میں اشاعت تعلیم ہے۔ کانفرنس اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ اس سے زیادہ جتنا آل انڈیا کانفرنس انجام دیتی ہے۔

کانفرنس کے روح رواں بلکہ جنوبی ہندوستان کی تمام تحریکات کے روح رواں صرف دو شخص ہیں۔ نواب غلام احمد اور مسٹر قریشی بی، اے۔ نواب غلام احمد ایک باثروت شخص ہیں لیکن قومی محبت سے ان کا دل لبریز ہے۔ قومی کاموں سے ان کو اس سے زیادہ دلچسپی ہے جتنی ان کو اپنے ذاتی کاموں سے۔ قومی مصائب پر ان کا دل اسی قدر جلتا ہے جتنا ذاتی مصائب پر۔ ہر سال اپنے ہزاروں روپے قوم کے لیے نذر کرتے ہیں۔ آجکل بیمار تھے۔ شریک کانفرنس ہوئے۔ مسٹر قریشی، مدراس کا عبدالحکیم ہے۔ بی، اے۔ بی ٹی ہے۔ گورنمنٹ نوکر تھا مگر سب چھوڑ چھاڑ کر مدراس کے قومی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے۔ انگریزی زبان پر بلا کا قابو رکھتا ہے۔ مدراس کے اکثر روزنامہ و ہفتہ وار

انگریزی اخبارات میں اس کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔

کانفرنس کا اجلاس تین دن رہا۔ مختلف تعلیمی ضرورتوں پر لکچر ہوئے۔ تعلیمی تجاویز منظور ہوئیں۔ میں نے دو تقریریں کیں۔ ایک تعلیم نسواں پر جس نے حاضرین پر اثر کیا اور پسند کی گئی۔ اس تقریر میں ایک یورپین خاتون کے مخفی اعتراضات کا جواب بھی تھا، جس نے مجھ سے پہلے اسی موضوع پر انگریزی میں تقریر کی تھی۔ دوسری تقریر شب کو مذہبی تھی جس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔

ختم اجلاس پر میں نے احباب کے ساتھ، جس میں خصوصیت کے ساتھ میں دو کا نام ضرور لوں گا، مسٹر قریشی اور مسٹر اسد اللہ بی، اے جو حیدرآباد میں رجسٹرار ہیں اور قومی درد رکھتے ہیں۔ بنگلور کا مشہور عجائب خانہ دیکھا جس میں میں نے دو اسلامی چیزیں دیکھیں۔ ایک پتھر پر ایک کتبہ جو سلطان ٹیپو کی کسی عمارت پر تھا، دوسرا ایک سنگی نقشہ جو حیدر علی کے تیار کردہ قلعہ و عمارات واقع سرنگاپٹن پایۂ تخت سلاطین میسور کا تھا۔ محبت سے میں نے ان کو دیکھا۔ دل میں ایک درد اٹھا۔ بے اختیار ہوگیا اور جی چاہا کہ اس افق کو دیکھتا جہاں ہندوستان کا آخری ستارہ طلوع ہوا اور ڈوبا۔

راستہ میں دوستوں سے ذکر کیا۔ اسد اللہ تیار ہوگئے۔ وہ بھی مدت سے اس کے آرزومند تھے۔ قرار یہ پایا کہ میں پہلے صبح کو مسٹر قریشی کے ساتھ کولار جاؤں، جہاں نواب غلام احمد خاں مقیم تھے اور ان کی عیادت کروں۔ شام کو واپس بنگلور آؤں۔ یہاں اسد اللہ خاں اسٹیشن پر طیار ملیں گے۔ ان کے ساتھ سرنگاپٹن کا ارادہ کروں۔

حسب قرارداد کولار روانہ ہوا۔ یہاں سے ڈھائی گھنٹہ کا راستہ تھا۔ نواب غلام احمد اور ان کے برادر بزرگ دونوں کو حد درجہ خلیق اور خاکسار پایا۔ مل کر نہایت خوش ہوا کہ ہندوستان کی اسلامی خاکستر میں اب تک دبی دبائی چنگاریاں باقی ہیں۔

یہاں سب سے قابل سیر سونے کی کانیں ہیں جو ریاست میسور کی مملوکہ ہیں۔ ۲ بجے اس کو دیکھنے چلا۔ اس کے لیے پہلے ریاست کے عہدہ دار سے ایک اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس اجازت نامہ کی وساطت سے انگریزی کمپنی سے، جو کان کی ٹھیکیدار ہے، دوسرا اجازت نامہ ملتا ہے۔ ریاست اور کمپنی دونوں کے سپاہی ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر کان کی سیر نصیب ہوتی ہے۔ بہر حال ان مراحل کو طے کر کے کانوں کے کارخانہ تک پہنچا۔ کانیں میلوں تک ہیں۔ نیچے نیچے کھودی جاتی ہیں اور اوپر معمولی مسطح زمین نظر آتی ہے۔ میں نیچے نہیں اترا۔ نیچے اترنا عام آدمیوں

کے لیے خطرناک ہے۔ صرف اوپر کی سیر کی۔ ایک کارخانۂ قدرت نظر آیا۔ ہر قدم پر انسان کی قوت کمال عقلی اور خدا کی صنعت فیاضی کے مناظر نظر آئے۔ وہ جگہ دیکھی جہاں مشین کی مدد کے ذریعے مزدور نیچے اترتے ہیں۔ ڈیڑھ دوہزار فٹ نیچے کان ہے لیکن صرف ایک ہی منٹ میں زینے سے نیچے آتے ہیں اور اوپر جاتے ہیں۔ زینوں کے نیچے اوپر جانے کے لیے ایک مشین کا مستقل کارخانہ اور عملہ ہے۔ اندر روشنی اور ہوا پہنچانے کا الگ کارخانہ ہے اور عملہ ہے۔ وہ جگہ دیکھی جہاں کانوں سے توڑ توڑ کر اوپر سونے کے پتھر لاتے ہیں۔ وہ جگہ دیکھی جہاں وہ پتھر توڑے جاتے ہیں۔ وہ مشین دیکھی جو ان پتھروں کو چورہ کرتی ہے۔ وہاں گیا جہاں سونے اور ذرات خاکی الگ ہوتے ہیں۔ پھر یہ خاک دوسری جگہ پانی کے ساتھ مل کر جاتی ہے۔ وہاں پر صاف کی جاتی ہے۔ یہی خاک پھر دوسری بار صاف کی جاتی ہے۔ تیسری بار خاک ہوائی اڑن کھٹولوں پر روانہ کی جاتی ہے۔ جس کو میں نے حیرت سے دیکھا۔ یعنی ایک پست مقام سے بلند مقام پر تار پر، یہ آہنی صندوق بلامدد آتے جاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے نشیب میں آنا معلوم لیکن من دومن خاک سے لدے ہوئے آہنی صندوقوں کا آہنی تاروں پر بلندی کی طرف دوڑ کر جانا میرے لیے طلسم ہوش ربا کا ایک منظر معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال یہاں کے عجائبات دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا کہ ہندوستان کو ترقی کے کس معیار تک پہنچنا ہے۔

کان سے واپس آکر شام کی گاڑی سے بنگلور واپس آیا۔ اسد اللہ اسٹیشن پر موجود تھے۔ میسور کی راہ لی۔ صبح ۷ بجے ہم میسور پہنچے۔ شہر دیکھا۔ راجہ کا خاص محل دیکھا۔ اتفاق سے محل کے سامنے ریاست کی کچھ فوج مصروف ورزش تھی۔ اس کا نظارہ کیا۔ شہر، شہری حیثیت سے پست ہے۔ پست وبدصورت مکانات، گندہ سڑک، بدہیئت دکانیں، پایۂ تخت میسور کی سرمایۂ ناز چیزیں ہیں۔ بعض عمارات اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر وہ خال خال ہیں۔ راجہ کا محل عالیشان اور خوبصورت ہے۔ مگر میری آنکھیں فلک نما کو ڈھونڈتی تھیں۔

بہرحال اس شہر کا گشت لگاتے ہوئے ہم سرنگاپٹن کو چل کھڑے ہوئے جو یہاں سے بارہ میل ہے۔ درمیان کے مقامات میں جابجا اسلامی عمارات کے نشانات ملتے تھے۔ کہیں کہیں شہداء کی قبریں نظر آتی تھیں جو اسلام کی آخری عظمت کے خاتمہ کا قصہ سنارہی تھیں۔ راستہ میں ایک

پل نظر پڑا جو کاویری ندی کی ایک شاخ پر تعمیر کیا گیا ہے۔ تمام انگریزی پلوں کے برخلاف اس کے ستون مخروطی مثلث کے بجائے مربع تھے جو بالکل عجیب و غریب چیز ہے۔ وہ ستون بھی محض ایک سالم پتھر سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔

تھوڑی دیر میں وہ میدان، وہ دیواریں نظر آئیں جو سلطانی فوج کی ورزش گاہ تھیں اور جہاں نشانہ کی مشق ہوتی تھی۔ آگے چل کر اس بدنصیب پایۂ تخت کا سواد نظر آیا جو اب بالکل ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر جگہ شہدائے اسلام اور انگریزی سپاہیوں کی قبریں ہندوستان کے آخری فیصلۂ قسمت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

سب سے پہلے ہم نے سلطان کے مزار کا قصد کیا۔ ایک وسیع باغ کے اندر خود سلطان کا بنا کردہ قبرستان ہے جہاں اکثر خاندان سلطانی کے ارکان مدفون ہیں۔ صدر دروازہ کی سقف پر اب تک نوبت و نقارہ بج رہا ہے، جس کی مہیب آوازیں ہمارے کانوں میں الفاظ ماتم و تعزیت بن کر آرہی تھیں۔ وسط میں سلطانی مقبرہ تھا۔ جس پر ایک عظیم الشان گنبد تھا۔ گنبد کے دروازہ پر چند کتبے تھے جن کو میں نے لکھ لیا ہے۔ ایک دروازہ کے اوپر، ایک دروازہ کی داہنی طرف کی دیوار پر اور ایک بائیں طرف کی دیوار پر جس کی صورت یہ ہے:

در شاہے کہ شہر الاسلام باب شیرے کہ کسر الاصنام
اوست سلطان دین و ہم دنیا بندۂ بارگاہ او علام

(بجانب راست) (بجانب چپ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم بسم اللہ الرحمن الرحیم
اللہ محمد ابوبکر عثمان علی رب ارحم السلطان الکریم
زہے گنبد کز شکوہ نہا ٹیپو سلطان شہید شد ناگاہ
فلک زیر دستش بود در علو خون خود ریخت فی سبیل اللہ
تو خواہی فلک خواہ خورشید خواں بود ذیقعدہ بست وہشتم آں
فلک داغ گروید از رشک او شدہ در روزشنبہ حشر عیاں
بود شمہ اش نورچشم فلک سرسالش بہ نیم ماہ بگفت

قمر یافتہ ضوء تعلیم ازو
تراوش کناں بحر رحمت زخاک
گروہے زکروبیاں گرد او
سحر گہ پے کسب فیض وشرف
گذشتیم ازیں خوابگاہ نکو
چوں ایں مضجع تازہ آمد بچشم
نمودم چو روحانیاں جستجو
کہ ایں شاہ آسودہ را نام چیست
چہ تاریخ رحلت نمودست او
یکے زاں میاں گفت تاریخ ونام
کہ حیدر علی خاں بہادر بگو
(من کلام غلام حسین)

نور اسلام و دیں ز دنیا رفت
تاریخ کشتہ گشتن سلطان حیدری
ٹیپو بوجہ دیں محمد شہید شد
جواں مرد میداں نہاں شد ز دنیا
یکے گفت تاریخ شمشیر گم شد
روح قدسی بعرش گفت کہ آہ
نسل حیدر شہید اکبر شد
(من کلام غلام حسین)

ان اخذت مصر کما قد ذکروا
وسرنخ (کذا) فتن اخذت بہا
مصیبۃ ما مثلھا ارختھا
ذھب عزالروم والھند کلھا
(من کلام الشیخ الجعفری)

قد صنفہ الحقیر میر حسین علی وحررہ سید عبد القادر بالخط الجلی

عربی کا قطعہ عروض ونحو کے اعتبار سے غلط ہے لیکن درد وجانگدازی صحت الفاظ پر منحصر نہیں۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے

عربی قطعہ اس اتفاق مصائب کا اظہار کر رہا ہے جو عالم اسلام کو سترہویں صدی کے اواخر یا تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان و مصر میں برداشت کرنا پڑا۔ ادھر قاہرہ نپولین کے زیر قدم تھا اور ادھر سرنگاپٹن پر یونین جیک لہرانے لگا۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقبرہ میں ایک دروازہ سے داخل ہونا پڑتا ہے جس میں سیاہ آبنوس کے کواڑ ہیں۔ اندر تین قبریں اس طرح تھیں:

سلطان ٹیپو شہید حیدر علی حیدر علی بیگم

سلطان ٹیپو کی قبر پر سرخ چادر اور دونوں قبروں پر سیاہ چادریں چڑھی تھیں۔ سرخ چادر اس خوبی پیرہن کی طرف اشارہ ہے جس کو پہنے سلطان سو رہا ہے۔ او شیر میسور اٹھ ! کہ اب اسلام تیری مدد کا محتاج ہے۔ ایک آواز تھی جو زبان دل سے بے اختیار نکلی اور جس کو صرف گوش دل نے سنا، مگر ہائے مہماں نواز، عاشق اسلام سلطان کے لب گور نے کوئی جواب نہ دیا۔ فرط محبت سے جی چاہا، گستاخانہ قبر سے لپٹ کر ایک چیخ ماروں لیکن خدام ادب نے آواز دی کہ ادب، ادب۔ آخر ہاتھ اٹھاکے اور فاتحہ کے چند پھول چڑھا کر باچشم نم باہر نکل آیا۔

مزار کے سامنے سلطانی مسجد تھی، جس میں مجاور اور مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں۔ عمارت متوسط حیثیت کی ہے۔ یہیں سے نیچے اتر کر دونوں بازوؤں میں دو مسقف عمارتیں ہیں جن کو مہمان سرائے سمجھتا ہوں۔ مزار پر اب تک مجاور قرآن خواں اور نوبت و نقارہ بجانے والے ریاست کی طرف سے مقرر ہیں۔

یہاں سے نکل کر ایک طرف اس دشمن اسلام خاندان کے ایک ممبر کا گنبد قبر ہے جس کا ایک رکن بنگال میں میر جعفر کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا رکن میر صادق کے نام سے یہاں معروف ہے اور جو سلطان شہید کا نمک حرام وزیر اور اسلام کا کافر بندہ تھا۔ میرے رفیق نے بیان کیا کہ اس کی قبر پر جوتوں کا ڈھیر ہے اور جس زائر کا وہاں گذر ہوتا ہے وہ اب تک جوتوں کی نذر اس کی قبر پر پیش کرتا ہے۔ دل نے نہ چاہا کہ دامن چشم اس مجرم اسلام کے دیدار سے آلودہ کروں۔

دریا دولت باغ پہنچا۔ یہ ایک باغ ہے جس کے وسط میں ایک عالیشان عمارت ہے جس میں سلطان رہا کرتا تھا۔ عمارت غالبا لکڑی کی ہے۔ یا مجھے ایسا معلوم ہوا۔ تمام دیواریں اور سقف مختلف خوشنما رنگوں سے رنگی تھی جس میں نہایت باریک بوٹے بنے تھے۔ سب سے پہلے یہاں سیاح کی جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ اس عمارت کے سامنے کی دیوار ہے۔ تمام دیوار پر سلطان ٹیپو اور حیدر علی کے معرکوں کی تصویریں ہیں۔ ابتدائے معرکہ سے لے کر اخیر معرکہ تک کی تصویر ہے۔ اوپر اس کی مختلف اوقات کی تصویریں ہیں۔ کہیں وہ مجلس رقص و سرود میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ کہیں وہ سویا ہے۔ کہیں اس کی گردن شہنشاہ حقیقی کے سامنے جھکی نظر آتی ہے۔ کہیں وہ بیٹھا قرآن مجید تلاوت کر رہا ہے۔ غرض عجیب منظر ہے۔ گھنٹوں تک حیرت نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور میں تعجب اور حسرت سے ایک ایک سپاہی، ایک ایک سوار بلکہ ایک ایک چیز کو دیکھ

رہاتھا۔ آخر رفیق کی آواز نے چونکادیااور ہم یہاں سے نکلے۔

قلعہ دیکھا جو صرف پتھروں سے بنایا گیاہے اور جس کے چاروں طرف کاویری ندی طواف کرتی ہے۔ قلعہ توڑ دیا گیاہے۔کچھ کچھ آثار باقی ہیں۔ قلعہ کے دروازے سے نکل کر سامنے شاہی جامع مسجد سنگی نظر آئی۔نیچے مکتب یا مدرسہ کے کام کی عمارت ہے۔اوپر مسجد ہے۔وسیع اور عالیشان ہے۔ منارہ بلند ہے۔ تقریباڈیڑھ سو زینے ہیں۔ ابتدائی زینے سنگی اور آخری ہیزمی[1] ہیں۔ مسجد میں ایک کتبہ ہے جس میں پانچ شعر ہیں۔ میں نے صرف دو نقل کیے ہیں۔

(اول) گر حضرت سلیماں اندر زمان ماضی — تعمیر مسجدے کرد نامش نہاد اقصی

(آخر)مانند زر چو باگشتم قاری برائے تاریخ — طاعت سرائے ثابت ہاتف نمود القا

۱۲۲۵

یہاں کی سیر ختم ہو چکی تھی۔ اسٹیشن پہنچا۔ یہاں سے بنگلور روانہ ہوا۔بنگلور سے وانمباڑی کی طرف روانہ ہوا۔

ریاست میسور کا اب علاقہ ختم ہوا۔ میسور کے متعلق میری رائے حیدرآباد سے زیادہ بہتر ہے۔ تعلیم یہاں نہایت عام ہے۔ اسکول سے ہر جگہ لڑکے اور لڑکیاں آتی جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ اسکولوں کی تعداد نہایت کافی ہے۔کالج بھی ہیں۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ ہے، جہاں مختلف صنعت و حرفت کی تعلیم ہوتی ہے۔ عورتوں میں بھی تعلیم شائع ہے۔ پردہ نہیں ہے، آزادی ہے، اس لیے لوگوں کی رائے ہے کہ اخلاقی حالت اچھی نہیں۔ ایک عجیب بات یہاں کی نسبت سنی کہ یہاں ہندوستانی محبوب اور یورپین و یوریشین عاشق اور یورپین اور یوریشین معشوق اور ہندوستانی عاشق نہایت کثرت سے ہیں۔

مسلمانوں میں یہاں بھی وہی مرض ہے جو ہر جگہ ہے۔یعنی جہالت۔ اب تعلیم پھیل رہی ہے۔ایک محمڈن سینٹرل ایسوسی ایشن آف میسور قائم ہے جس کی طرف سے کچھ نائٹ اسکول قائم ہیں۔کچھ واعظ ہیں جو مسلمان قیدیوں میں وعظ کہتے ہیں۔چندۂ طرابلس میں یہاں کے مسلمانوں نے بھی حصہ لیا اور تقریبا دو ہزار کا چندہ ہوا۔یونیورسٹی میں ۲۰ ہزار کا فنڈ وصول

---

[1] یعنی لکڑی کا بنا ہوا۔

ہوا۔ ایک فری ریڈنگ روم قائم ہے اور بھی قومی تحریکیں مثلاً مسلم ہال، تعلیمی وظائف اور انتظام اوقاف اسلامیہ جاری ہیں۔ مگر ان تمام تحریکات کا نفس ناطقہ کون ہے؟ نواب غلام احمد!

وانمباڑی دامن کوہ میں ایک متوسط اسلامی آبادی ہے۔ باشندے زیادہ تر مسلمان اور خوش حال تاجر ہیں۔ قومی تخیل یہاں قابل تعریف ہے۔ مسلمانان مدراس کا قومی ہائی اسکول یہیں قائم ہے۔ یہاں تقریباً دس بارہ مسلمانوں کے ابتدائی مدارس اور زنانہ مدرسے، دو کلب، دو عربی مدرسے، اس ہائی اسکول کے سوا اور موجود ہیں۔ ہائی اسکول کے ہڈماسٹر مسٹر قریشی ہیں۔

اس شہر میں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک ہائی اسکول میں طلبہ اور ماسٹروں کے سامنے۔ موضوع بحث "تعلیم" تھا۔ دوسرا اسی شام کو بعد مغرب جامع مسجد میں حرب رسول پر وعظ کیا۔

وانمباڑی سے ۱۳/ ۱۴ میل کے فاصلہ پر ایک تاریخی مقام گڑ آم بور ہے۔ یہیں وہ میدان ہے جہاں چاند خاں اور انورالدین خاں میں حکومت کرناٹک کے لیے فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ دونوں مدعی تھے۔ چاند خاں کے طرف دار فرانسیسی تھے اور انورالدین خان کے انگریز۔ انورالدین خاں گو مارا گیا لیکن فتح انگریزوں کو ہوئی۔ یہیں وہ پہاڑ واقع ہے جس پر ایک نہایت مضبوط قلعہ تعمیر تھا۔ اسی کے پہاڑی سلسلہ میں حیدر علی اور ٹیپو نے اپنی وہ جنگی سڑک طیار کی تھی جس پر میسور سے چل کر چھپتا چھپاتا ساحل ملیبار تک پہنچ جاتا تھا اور انگریزوں کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔ اس قدیم سڑک کا نشان اب تک باقی ہے۔ یہیں والی کرناٹک کا ایک مستحکم قلعہ میدان میں تھا جس کی کچھ دیواریں اور دروازہ اب تک باقی ہے۔ (یہیں والی کرناٹک کا) جو کاروانِ گذشتہ کا گویا صرف ایک نقش قدم ہے۔ میں احباب کے ساتھ گڑ آم بور گیا۔ ایک ایک چیز دیکھی۔ پہاڑ پر چڑھا۔ میدان میں پھرا۔ انورالدین خان کے مقام شہادت پر ایک چبوترہ بنا ہے۔ قبر یہاں نہیں ہے۔ مگر مجاور ہیں۔ مجاوری کا کچھ وقف ہے۔ پہاڑ پر ایک دو کمین گاہ اب تک موجود ہیں۔ یہاں میدان میں ایک معمولی سی مسجد اور گنبد قبر ہے جو زمانۂ جنگ کے پہلے کی تعمیر ہے۔ مسجد پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

میر صفدر عز شانہ جود و کرم ساخت مسجد بہر طاعت فی المثل بیت الحرم
گفت رضوانم بگو تاریخ ایں عالی بنا ختم شد از فضل رب مسجد کبیب محترم

محمد قانع کتبہ ابوتراب باہتمام میر محمد حسین عرف سید کری

یہاں کی زیارت سے واپس آکر ایک دن کے بعد وہاں پہنچا جو میرے سفر کا منتہی تھا۔ یعنی شہر مدراس۔ مدراس میں ڈیڑھ دن صرف رہا۔ نواب غلام احمد کا وہاں کمرشل آفس ہے۔ نواب صاحب کے نائب محی الدین پاشا اسٹیشن پر موجود تھے۔ تپاک سے ملے اور جب تک میں رہا اخلاق و محبت سے ملتے رہے۔ ڈیڑھ دن کے لیے آفس کی موٹر میرے لیے وقف کر دی۔ اتنی مدت میں جو کچھ دیکھ سکا، دیکھا۔ یہاں کی مشہور چیزیں: مچھلیوں کا عجائب خانہ، ہائی کورٹ کی عمارت، لا کالج، کرسچین کالج، فورٹ سینٹ جارج، ساحل مرینا وغیرہ ہیں۔ یہ تمام چیزیں دیکھیں۔ مچھلیوں کا عجائب خانہ، یہاں کی مشہور اور مخصوص چیز ہے۔ سمندر کے کنارے ایک مختصر عمارت ہے جس کے چاروں طرف شیشہ کی الماریاں ہیں جن میں پانی بھرا ہے اور مچھلیوں کی اصلی قوت قائم رکھنے کے لیے برقی تار اس میں دوڑائے ہیں۔ ان مختلف الاشکال، مختلف الالوان مچھلیوں کو دیکھ کر خدا کی قدرت نظر آئی۔ کوئی شکل، کوئی رنگ ایسا نہ ہو گا جس کی مچھلی نہ ہو۔ عجائب المخلوقات کے مصنف کہتے ہیں: جس طرح اٹھارہ ہزار مخلوق عالم میں خدا نے پیدا کی ہے، اسی طرح اٹھارہ ہزار عالم بحر میں بھی ہے۔ اس عجائب خانہ کو دیکھ کر میں اس مسئلہ پر ایمان لایا۔

یہاں کا مردہ عجائب خانہ دیکھا۔ مگر عجائب خانہ کلکتہ کے سیاح کے لیے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں۔ البتہ اسلحہ خانہ میں کچھ دلچسپی ہے مگر میں نے صرف ایک چیز یہاں دیکھی اور وہ گویا میری سیر کا حاصل تھی یعنی دو قلمی تصویریں، سلطان حیدر علی اور ٹیپو کی فوجی نقل و حرکت کی، بیچ میں سلطان کا ہاتھی جس پر سلطان سوار ہے۔ امراء گھوڑوں پر آگے پیچھے ہیں۔ توپوں کا سلسلہ ایک طرف سے سوار دو خط مستقیم میں منقسم ہو کر داہنے بائیں آگے پیچھے پیدل ہیں۔ اونٹوں پر خیمے لدے ہیں۔ سب کے آگے ہاتھی پر سرخ پرچم لہرا رہا ہے اور اس قواعد کے ساتھ فوج کوچ کر رہی ہے۔ عجیب سماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ میرا جسم اس وقت گو بیسویں صدی میں تھا لیکن میری روح ڈیڑھ صدی پیچھے کے مناظر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک کتب خانہ بھی ہے، وسیع ہے، انگریزی کتابوں کا انبار۔ مشرقی شاخ کی نسبت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں یہ شاخ نہیں۔ تعجب ہے! پھر حکومت کرناٹک کا کتب خانہ کہاں گیا؟ ہائی کورٹ کی عمارت اسلامی طرز کی تھی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی اسلامی عمارت تھی جس کو قطع و برید کے بعد ہائی کورٹ بنایا گیا۔

یہ سب چیزیں دیکھیں مگر میری آنکھ چند بالشت زمین کی زیارت کی مشتاق تھی۔ جہاں اسلامی علوم وفنون کے بحر ذخار کی آخری موجیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔ یعنی بحر العلوم کی تربت پاک۔ نواب والا جاہ والی کرناٹک کی بنوائی ہوئی یہاں پتھر کی ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے۔ اسی کے ایک پہلو میں بعض شاہان ارکاٹ کا مقبرہ ہے۔ بحر العلوم کی قبر بھی ان ہی سلاطین کے پہلو بہ پہلو ہے۔ علم کے تاجدار کا رتبہ، دولت و مملکت کے تاجدار سے کم نہیں۔ مرقد مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھا۔ افسوس قبر پر کوئی کتبہ نہیں۔ جاہل قرآن خواں مقرر ہیں جو ایصال ثواب کے لیے ہر روز وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھا کرتے ہیں۔ ان سے اس شہر خاموش کے بعض باشندوں کے نام و حالات پوچھے تو وہ انتہائے جہالت کی وجہ سے اتنا بھی نہیں بتا سکے کہ ان گمنام ناموروں کے نام کیا ہیں۔

یہاں ایک ہمارا ہم وطن بھی سو رہا ہے جس کی قبر پر پتھر کا ایک کتبہ ہے جس پر اس کا نام اور تاریخ وفات کندہ ہے۔ نام وجیہ الدین ابن مجیب اللہ، باشندہ عظیم آباد کندہ ہے۔ تاریخ وفات ۱۲۲۹ لکھی ہے۔ جامع مسجد وسیع اور عالیشان۔ مادۂ تاریخ شعرا نے اچھا نکالا ہے:

امیر الھند والا جاہ فرمود   بنا ایں مسجد فرخندہ منظر
زدل از بہر تاریخ بنایش   ندا آمد کہ ذکر اللہ اکبر
ساخت طاعتگہ اسلام شہ دیں پرور   آنکہ فرماں بر آں ہست زمہ تا ماہی
بہر تاریخ بنایش بخرد ہاتف گفت   نام فرخندۂ وے مسجد والا شاہی

اسی روز رات کو ۱۰ بجے کی گاڑی سے مدراس سے بمبئی روانہ ہوا۔ راستہ میں دو شہروں کے دیکھنے کو دل مچلا۔ گلبرگہ اور پونہ۔ مگر آئندہ کے وعدہ پر سمجھایا۔ بارے مان گیا۔ جسٹس عبد الرحیم سے مدراس میں ملنے کا وعدہ تھا مگر افسوس قلت فرصت کی وجہ سے نہ مل سکا۔ جسٹس موصوف متواضع اور خاکسار ہیں اور متاثر دل رکھتے ہیں۔ مجھ سے نہایت خلوص سے بار بار ملے۔

والسلام

سید سلیمان

۵؍ اگست ۱۹۱۲ء

تبصرۂ کتب

مولانا محمد الحسنی، الاسلام ضالۃ العالم (جلد اول و دوم)، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات بالترتیب ۵۰۰، ۴۹۸، قیمت درج نہیں، سن اشاعت ۲۰۲۴ء، پتہ: جامعۃ الہدایہ، رام گڑھ روڈ، نیر، مان پور سدوا، پوسٹ آفس للواس، جے پور ۳۰۲۰۲۷، راجستھان، موبائل: ۸۹۵۵۲۷۰۷۲۶

ندوہ کے بے شمار فضلاء و فیض یافتگان ہیں جنہوں نے اردو ادب و انشا اور صحافت و خطابت کی دنیا میں اپنی مہارت و صلاحیت سے شہرت اور نیک نامی حاصل کی۔ مگر عالم عرب کے اہل زبان ادیبوں اور انشا پردازوں کی طرح نہایت خوبصورت اور دلکش اسلوب میں لکھنے کی جو اعلیٰ صفت اور امتیازی خوبی مولانا سید محمد الحسنی کو عطا ہوئی، اس میں کم ہی ان کے ہم سر ملیں گے۔

ندوہ کے عربی ترجمان ماہنامہ رسالہ البعث الاسلامی کے افق سے وہ طلوع ہوئے اور بہت جلد اپنی تحریروں خصوصاً البعث الاسلامی کے اور جریدہ الرائد کے اداریوں یا افتتاحیوں کی وجہ سے وہ عربی صحافت کے آسمان پر روشنی کی خاص علامت بن گئے۔ یہ روشنی ادب و انشاء کے ساتھ اسلام کے پیغام کی فکر اور اس کی دعوت کی توسیع تھی۔ جس نے خاص طور پر عالم عرب میں اسلامی صحافت کی ضرورت و اہمیت کا گویا ایک نیا باب کھول دیا۔ مولانا محمد الحسنی کی کل متاع حیات لگ بھگ چوالیس سال کی عمر تھی۔ ان کا وہ افتتاحیہ جو ان کے قلمی سفر کا اختتامیہ بھی بن گیا اس کے متعلق مولانا سید محمد رابع ندوی نے لکھا کہ وہ "من اقوی الافتتاحیہ"۔ وہ سب سے پر زور افتتاحیہ تھا جس میں انہوں نے عرب حکمرانوں سے کہا تھا کہ نئے اسلامی انقلاب کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ قول و عمل کے تضادات کو بلکہ کوڑے کے ڈھیر کو صاف کرنا ہے۔ یہ کام حکومت اور عوام دونوں کی سطح پر ہونا چاہیے۔ یہ جدید کاروانِ اسلام کی پہلی شرط ہے جو انقلاب اسلامی کو تیز گام بنا سکتی ہے یا کم از کم اس کی ہمرہی کر سکتی ہے اور یہ کہ ہماری امیدیں جزیرۂ عرب اور مملکت سعودیہ سے وابستہ ہیں کہ وہ اس میدان میں پیش قدمی کریں۔ عربی کی اسی تحریر میں جو قوت اور جوش و ولولہ ہے۔ اس کی حدت و حرارت کا اندازہ اصل عبارت ہی سے ممکن ہے۔ مگر اس

غیر معمولی پر جوش و پر قوت تحریر میں شاید یہ پیغام بھی چھپا تھا کہ صاحب قلم نے اپنا فرض ادا کر دیا اب اس کی روشنائی کے خشک ہونے کا وقت آچلا ہے۔

رسالہ البعث الاسلامی کا آغاز ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ وہ زمانہ کمیونزم کے فروغ اور کمیونسٹ حکومتوں کی فرماں روائی کا تھا، اسی دور میں عرب قومیت کی بھی دھوم تھی، نئی نسل اس ذہنی انقلاب کا سب سے بڑا شکار تھی۔ البعث الاسلامی کے اولین اداریہ میں مولانا محمد الحسنی نے اسی نوجوان نسل کو اپنا مخاطب بنایا وہ خود بھی نوجوان تھے۔ جوش کی کمی نہ تھی، لکھ دیا کہ البعث، قاہرہ اور بیروت کے ان ادبی رسالوں کی طرح نہیں جن کے لیے ادب صرف آلہ لہوولعب ہے، جن کا بڑا مقصد یورپ کی مدح وثنا ہے۔ اور جن کی حکمرانوں اور سرمایہ داروں کی قربت پانے کے سوا اور کوئی غرض نہیں۔ پہلے افتتاحیہ میں جس فکر اور جذبہ کا اعلان ہوا وہ آخری اداریے تک جاری رہا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۹ء تک دنیا کے حالات کے ساتھ عنوان بدلتے رہے لیکن روح وہی رہی جس کو سید ابوالحسن علی ندوی نے منہج الفکر الاسلامی السلیم والدعوۃ الی الحق والی الصراط المستقیم، سے تعبیر کیا۔

وقت کے تقاضوں کے تحت یہ تجویز واقعی بڑی ضروری اور مبارک تھی کہ مولانا محمد الحسنی کے تمام اداریوں کو یکجا کر کے شایع کیا جائے۔ جامعۃ الہدایہ کے قابل فخر فرزند اور ذمہ دار مولانا محمد فضل الرحیم مجددی کا نام اس مبارک کام کے لیے توفیق ایزدی نے چن لیا۔ مولانا مجددی کی ایک بڑی خوبی، سلیقہ شعاری ہے اور اس کا عمدہ نمونہ پیش نظر یہ دونوں جلدیں ہیں۔ کتاب کا عنوان بھی حسن ذوق کا اعلان ہے اور البعث کے اداریوں کے عنوانات کی خوبصورت تعبیر بھی ہے۔ اردو میں ایک طالب علم کے لیے یہ اسلام متاع گم گشتہ جہاں ہی ہے۔ افتتاحیوں کی سرخی میں جیسے خون دل کی چمک آگئی ہے، المحیا محیاکم والممات مماتکم، مشکلۃ کبری وحل اکبر، شہداء الاخوان یتکلمون، الغرب المتکبر والشرق المستنکر، صراع الرفض والقبول، قفوا ھذا الطریق مسدود، سجل یا تاریخ واشہد یا زمان، آلات التعذیب تتکلم، ارادوھا جنۃ فانقلبت جحیما، دعوا الاسد یستیقظ وغیرہ عنوانات ہی سے جدت تعبیر وتفہیم ظاہر ہو جاتی ہے۔

دونوں جلدوں کو تعارفی تحریروں نے اور بھی قیمتی بنا دیا ہے، مرتب کتاب مولانا مجددی کے علاوہ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کے تقدیمی کلمات محض رسمی نہیں، بذات خود مستقل مضامین ہیں۔ ایک

مضمون مولانا نعمان الدین ندوی کا ہے اور نہایت دلکش زبان اور اسلوب میں ہے۔ ان سب پر مستزاد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بیش قیمت اور یادگار تحریر بھی ہے جو اصلاً مولانا محمد الحسنی کی کتاب الاسلام الممتحن کا مقدمہ تھی۔ خوب ہوا جو اس کو کتاب میں پیش کر دیا گیا۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

محمد طارق الانصاری غازی، ذکر ک، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۴۴۷، ملنے کا پتہ: مکتبۂ ملت، دیوبند، دینی کتاب گھر، مسجد قاضی، دیوبند، سہارنپور، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۲۷۸۲۶۸۔

عالمی شہرت یافتہ صحافی محمد طارق الانصاری غازی مرحوم نے کوچۂ صحافت میں چالیس سال گذارے۔ اس دور میں انہوں نے سات ہزار اداریے، مقالے، تجزیے اور سیاسی تبصرے کیے۔ معارف سے بھی ان کا رشتۂ صحافت استوار تھا۔ کئی مضامین اور نظمیں اس میں شائع ہوئیں۔ ان کی دواہم کتابوں نظریۂ تہذیب اور تذکار الانصار کو حسنِ قبول حاصل ہوا۔ زیر نظر کتاب پر مصنّف نے تقریباً سولہ برس باوضو صرف کیا ہے۔ امام بخاریؒ کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ انہوں نے بھی ہر روایت باوضو سپرد قلم کی ہے۔ صاحب کتاب نے تحدیث نعمت کے طور پر اس واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے کہ کتاب اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی کہ حضرت اسعدؓ بن زرارہ انصاری کی فجر کے وقت خواب میں زیارت ہوئی اور فرمایا کہ "ذکر ک" کے اجرا کے لیے آنحضورؐ نے انہیں بلایا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس کتاب میں آنحضورؐ کی مدنی زندگی کا مبسوط ومفصل عمرانی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنّف کے بہ قول مکی زندگی کی تیرہ سالہ تاریخ ایسے واقعات سے خالی ہے جن کا عمرانی تجزیہ کیا جائے۔ اس کے برعکس مدینے میں مسلسل اقدامی کارروائیوں اوران کے نتائج پر مشتمل واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ مشرکین کے خلاف فوجی اقدامات کی اجازت ملی۔ بالخصوص بدر وخندق میں آپؐ کے جنگی اقدامات کی جو تدبیریں اور حکمتیں سامنے آئیں اس نے اس زمانے کی دوسوپر پاور فارس وبیز نطینہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ بہ قول مصنّف انہیں حیران کن واقعات سیرت کا تجزیہ اس کتاب میں کیا گیا ہے اور خوب کیا گیا ہے۔ کل پچاس ابواب میں ہر باب کسی ایسے عنوان سے معنون ہے جس سے مصنف کے الگ نقطۂ نظر سے مطالعہ سیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ باب ۱و۲ کا عنوان ماضی

ہے لیکن اس کے اندر قریش وانصار کی تکوین پر ایسی بحث کی گئی ہے جو سیرت کی کسی اور کتاب میں نہیں ملے گی۔ دونوں قوموں پر تاریخی نگاہ ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کی پانچ سو سال تک ہمہ جہت تربیت کرنے کے بعد آنحضورؐ کو ان میں مبعوث فرمایا تاکہ یہ دونوں قومیں آنحضورؐ کی دعوت کو قبول کرنے کی اہل ہوسکیں (ص ۴۵) ۔ لیکن اگر اس متفرد خیال اور خدائی نظام تربیت کو تسلیم کرلیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان ادوار میں ان خاندانوں میں بگاڑ آیا ہی نہیں کیونکہ جب ان کی تربیت خصوصی نگرانی میں ہورہی ہو تو عقیدۂ توحید و آخرت میں فساد کیوں کر ممکن ہوگا، جب کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مشرکانہ رسوم وعقائد اور فکری وتہذیبی بگاڑ ایک مدت سے ان کے اندر موجود تھا۔ آپؐ کی بعثت تو اسی فکری و معاشرتی اصلاح اور عقیدۂ توحید و آخرت کی سربلندی کے لیے ہی ہوئی تھی۔ ایسے میں پانچ صدیوں تک اللہ تعالیٰ کی اس قوم کی ہمہ جہت تربیت کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔ باب ۳ عقبہ اولیٰ کو ”نمود سحر“ اور باب ۸ عقبہ ثانیہ کو ”مقدر سے معاہدہ“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ باب ۱۴ کا عنوان ہجرت ہے لیکن اس کا نام ”مدینہ منورہ ہوتا ہے“ رکھا گیا ہے۔ یہی حال تمام ابواب اور ان کے عناوین کا ہے۔ کتاب کا سب سے دلچسپ پہلو واقعات سے اخذ نتائج کا ہے۔ استنباط نتائج سے اختلاف ممکن ہے لیکن مصنّف کے قلم نے اس میدان میں جو نکتہ آفرینی کی ہے وہ یقینا نظر کشا ہے۔ مثلا احد میں مسلمانوں کو شکست اور کافروں کو فتح ہوئی۔ مسلمان آنحضورؐ کی موجودگی اور حق پر ہونے کے باوجود ہار گئے لیکن کافر اور مسلمان معاشرے میں فرق دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس ہار پر مسلمانوں کے تعجب کا اظہار سرگوشیوں سے آگے نہ بڑھا، الزام تراشیوں کی جنگ نہ بنا، مجاہدین بوڑھے ہوں یا جوان خود اپنا جائزہ لے رہے تھے۔ شکوہ شکایت کا بازار گرم نہیں تھا..... اس کے برعکس مشرکین کی فوج میں اختلاف، طعن وتعریض اور جھگڑے کی مستقل فضا تھی (ص ۳۳۰)۔ ظاہر ہے یہ نبوی تربیت کا اثر تھا۔ مہاجر اور انصار کے لقب کے سلسلے میں ان کا یہ موقف بھی پہلی بار سامنے آیا ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے یہ القاب اگرچہ مکہ ومدینہ کے مسلمانوں کی پہچان تھے لیکن ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ یہ باہم دونوں جماعتوں پر یکساں صادق آتے تھے۔ مہاجرین بلاشبہ انصاری بھی تھے کہ اسلام کے سب سے پہلے وہی حامی وناصر تھے۔ اسی طرح انصار نے بھی ہجرت کی تھی۔ مہاجرین نے گھربار اور املاک سے ہجرت کی تھی، انصار نے بھی مواخات کے تحت اپنے مال وجائیداد مہاجرین کی خاطر چھوڑ دیں۔ یہ بھی ہجرت کی ہی مثالیں

تھیں (ص ۱۸۹)۔ ”انصار کی ہجرت“ کے نام سے معارف میں ان کا مقالہ بہت پہلے شائع ہو چکا تھا۔ غزوۂ بدر کے سلسلے میں مصنّف نے اس نکتے کا انکشاف کیا ہے کہ اہل قریش سال میں ایک بار شام موسم گرما اور ایک بار یمن موسم سرما میں جاتے تھے لیکن مہاجرین اور آنحضورؐ کی ہجرت کے بعد قریشی تاجروں کی عادت میں غیر معمولی تبدیلی دیکھی جانے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مہاجرین کے متروکہ اموال و جائیداد پر قبضہ کر کے ان کا غلط استعمال شروع کر دیا تھا اور انہیں اموال سے جنگوں کے لیے ہتھیاروں اور جانوروں کی خریداری کرنے لگے تھے۔ ان قافلوں کے تعاقب میں بھیجی جانے والی مسلم فوجی ٹکڑیوں کا مقصد یہ پیغام دینا تھا کہ ریاست مدینہ ان سے ناواقف نہیں ہے (ص ۲۴۷)۔ اس لیے ان تجارتی قافلوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ان کی ذمہ داریوں میں تھا۔

کتاب مفید و نفع بخش معلومات کی حامل اور بڑے اہم عمرانی تجزیے پر مشتمل ہے۔ واقعات سیرت کا جس گہرائی اور معیار کی بلندی سے تحقیقی و تنقیدی تجزیہ اس میں کیا گیا ہے، عام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ان تجزیوں کی تہ تک پہنچ پانا آسان نہیں ہے۔ مصنف کے لیے یہ کتاب یقیناً بیش قیمت توشۂ آخرت ہے۔ (کلیم صفات اصلاحی)

حافظ ابو یحیٰ محمد شاہ جہاں پوری، الارشاد الی سبیل الرشاد فی امر التقلید والاجتہاد، پیش کش: ڈاکٹر بہاء الدین محمد سلیمان، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۴۲۸، ملنے کا پتہ: الدار الاثریہ، اثری منزل، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں۔ موبائل نمبر: ۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵۔

اس کتاب کا موضوع تقلید واجتہاد ہے۔ اس میں مقلد اور غیر مقلد کے درمیان موجود بنیادی اور مختلف فیہ مسائل اور دونوں مکاتب فقہ کے طرز عمل کا موازنہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور اہل تقلید کے اعتراضات کا تحقیقی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی اہمیت اس سے بھی واضح ہے کہ ایک زمانے میں یہ اہل حدیث واعظین کے تربیتی نصاب کا حصہ تھی۔ بنیادی طور پر اس کتاب کو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ۷۴ صفحات پر مشتمل مختصر رسالہ سبیل الرشاد کا جواب بتایا گیا ہے لیکن اس میں اس موضوع سے متعلق بعض دوسرے علما و محققین کی تحقیقات پر بحث اور اہل حدیث کی قدیم و جدید تاریخ بھی آ گئی ہے۔ اہل حدیث سے نفرت کے اسباب بھی تلاش کیے گئے ہیں۔

مسجد میں داخلہ اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کے متعلق احناف اور اہل حدیث کے درمیان اختلاف اور دہلی کے تحریری معاہدے اور ان مقدمات کی تفصیل بھی دی گئی ہے جو اہل حدیث کے اسلام سے خارج ہونے کے متعلق ملک کی مختلف عدالتوں میں اس زمانے میں قائم کیے گئے تھے۔ اس میں بجا طور پر اہل حدیث کو کامیابی ملی تھی۔ ص ۸۴ پر امام ابو حنیفہ کے بہت سے مسائل میں رجوع ہونے کی بات کہی گئی ہے لیکن کوئی ایک مسئلہ بھی بہ طور ثبوت نقل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی مقامات دعویٰ بلا دلیل کی مثالوں کے حامل ہیں۔ سیرۃ النّعمان کے فقہی مباحث خاص طور پر زیر بحث آئے ہیں۔ بعض نکات سے اختلاف بھی کیا گیا ہے مگر دلائل بہت ٹھوس اور علمی نہیں ہیں۔ ان چند جملوں ”شبلی نے اپنی خوش فہمی میں امام بخاری پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے“ یا یہ کہ سیرۃ النعمان میں جس قدر سقطات پیش آئے ہیں ان کے لیے مستقل تالیف کی ضرورت ہے (ص ۲۵۶) سے ناظرین مصنّف کا مزاج سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۱ میں منظر عام پر آئی لیکن اس کے بعد متعدد اہل علم نے اپنے اپنے طور پر اس میں اضافہ کر کے اس کو شائع کیا۔ تاہم ایک صدی بعد بھی مصنّف کتاب کے مختصر حالات میں اب تک کسی نے اضافہ نہیں کیا۔ تازہ پیش کش ڈاکٹر بہاء الدین محمد سلیمان کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے اس ایڈیشن میں آیات، احادیث اور حوالوں کی تخریج اور تعلیق تو کی ہے۔ مگر وہ بھی اس حصے کو پر نہ کر سکے۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت ساری کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کرتی ہے۔ ص ۲۰ پر کیے گئے دعویٰ کہ اس میں اکثر ایسے دلچسپ مضامین ہیں جو مالاعین رأت ولااذن سمعت کے مصداق ہیں پر یقین مشکل ہے کیوں کہ اس میں تقلید واجتہاد اور مقلد و غیر مقلد کے متعلق زیادہ تر وہی اختلافی اور غیر ضروری مسائل و موضوعات ہی زیر بحث آئے ہیں جو لوگوں میں بالعموم مشہور ہیں اور جن کی فی زمانہ بہت معنویت اور اہمیت بھی نہیں ہے۔ (ک۔ص اصلاحی)

الشیخ حسنین محمّد مخلوف، کلمات القرآن (تفسیر وبیان)، اعتنی بها وقدّم لها الدکتور أبوسحبان روح القدس الندوی، مؤسّسة القدس لخدمة الحدیث وعلومه، لکناؤ ـالهند، ۱۴۴۳ھ/۲۰۲۲م، صفحات: ۳۲۰، قیمت مذکور نہیں۔ ای میل: abusahban@gmail.com

اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر ابو سحبان روح القدس ندوی نے لکھا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات سے براہ راست قرآن مجید پڑھا، سمجھا اور اس کی آیتوں کی مراد اور توضیح کا علم

حاصل کیا تھا۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد صحابہؓ اپنے ان ساتھیوں سے قرآن مجید کے مشکل مقامات کو حل کرنے میں تعاون لینے لگے، جو قرآن مجید کی تاویل وتفسیر میں ان سے زیادہ واقف تھے مثلاً: حبر الأمۃ وترجمان القرآن عبداللہ ابن عباس (م:۶۸ھ) اور عبداللہ بن مسعود وغیرہ۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد، "الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی" اور "البرھان فی علوم القرآن للزرکشی" وغیرہ جیسے مراجع کی روشنی میں چند مشہور لغات القرآن پر دور صحابہ سے لے کر موجودہ زمانے تک ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد لغات القرآن کی قدرے طویل موضوعاتی فہرست دی گئی ہے۔ ان میں غریب القرآن لابن عباس، غریب القرآن لأبان بن تغلب البکری (م: ۱۴۱ھ)، معانی القرآن لمحمد بن حسن النحوی (م: ۱۷۰ھ)، اعراب القرآن ومعانیہ للزجاج ابراہیم بن السری (م: ۳۱۱ھ)، کتاب الغریبین (غریب القرآن والحدیث) لأبی عبید الھروی (م: ۴۰۱ھ) وغیرہ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ اس کے بعد برصغیر کے علمائے لغات القرآن کی کاوشوں میں سے مفردات القرآن للفراہی، لسان القرآن لمحمد حنیف الندوی، لغات القرآن لعبدالرشید النعمانی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے یہ مشہور روایت منقول ہے کہ انہیں "فاطر السماوات والارض" کے معانی کا ادراک نہیں ہو پا رہا تھا۔ انہوں نے دو بدوؤں کو کنویں سے پانی بھرتے ہوئے دیکھا کہ وہ باہم جھگڑ رہے ہیں کہ پہلے میں پانی بھروں گا۔ ان میں سے ایک یہ کہہ رہا تھا: "أنا فطرتھا" یعنی ابتدأتھا (یعنی میں نے اس کو شروع کیا تھا)۔ اس کے بعد ہی حضرت عبداللہ بن عباس کو "فطر" کے معنی سمجھ میں آئے۔

موجودہ کتاب کے مصنف شیخ حسنین محمد مخلوفؒ (۱۸۹۰-۱۹۹۰) ہیں۔ ان کی تعلیم جامعہ ازہر میں ہوئی ہے اور وہ ایک زمانے تک جامعہ ازہر میں درس و تدریس سے وابستہ رہے، مصر کے مفتی رہے اور پھر قاضی بھی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ وہاں کے مختلف اداروں سے ان کا تعلق رہا، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے بھی رکن تھے اور ان کی گرانقدر علمی خدمات کی بناپر انہیں ۱۹۸۳ء میں شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں: ۱-شرح عدۃ الحصن الحصین لابن الجزری، ۲-شرح البیقونیۃ فی مصطلح الحدیث، ۳-شرح الشفا فی شمائل صاحب الاصطفا للملّا علی قاری، ۴-الاسلام بین المشرق والمغرب۔ ان کے علاوہ ان کی کتابوں میں "کلمات القرآن" بھی

شامل ہے۔

اس کتاب ''کلمات القرآن'' کا منہج یہ ہے کہ ہر سورہ کے مفردات القرآن دیے گئے ہیں اور ان کے سامنے ان کے معانی دیے گئے ہیں۔ بطور نمونہ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ: وفقنا للثبات على الطريق الواضح الذى لا اعوجاج فيه وهو الإسلام.

خلوا إلى شياطينهم: انصرفوا إليهم أو انفردوا معهم.

الغمام: السّحاب الأ بيض الرّقيق.

لا فارض ولا بكر: لامسنّة ولا فتية.

الكهف: النقب المتسع فى الجبل.

الرقيم: اللوح فيه أسماؤهم وقصتهم.

من دسّاها: نقصها وأخفاها وأخملها بالفجور.

علق: دم جامد استحال إليه المنى.

والعاديات: قسم بالخيل تعدو فى الغزو.

التكاثر:التباهى بكثرة متاع الدنيا.

طيرا أبابيل: جماعات متفرقة متتابعة.

سجّيل: طين متحجّرة محرق آجرّ.

من مسد: مما يفتل قويا من الحبال.

وقب: دخل ظلامه فى كل شىء.

الوسواس: الموسوس جنّيا أو إنسيّا.

الخناس: المتوارى، المختفى.

ڈاکٹر سبحان ندوی لائق مبارک ہیں کہ انہوں نے ''کلمات القرآن'' جیسی اہم کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن شائع کیا۔ جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی دنیا بھر میں بڑی شہرت ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کی طباعت مختلف ملکوں میں ہو رہی ہے، اس کی زبان بہت آسان ہے۔ میں نے اس کتاب کو ہندوستان میں تعلیمی اداروں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا ہے، تاکہ اس کے ذریعے فہم قرآن اور اس کے تدبر میں اضافہ ہو۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

نعت مبارکہ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
گوشۂ مطالعاتِ نعت، علی گڑھ

اِن آنکھوں سے دیکھ آئے مکہ بھی مدینہ بھی
امید ہے اب آساں ہوجائے گا جینا بھی

کچھ لمحے گزارے تھے جنت کے بغیچے میں
لگتا تھا زمیں پر ہے فردوس کا زینہ بھی

پنجوقتہ نمازیں وہ سرکارؐ کی مسجد میں
آدابِ وفا سیکھے اور سیکھا قرینہ بھی

چالیس نمازوں کا وہ ذوق و طمانیت
انوارِ عقیدت سے معمور تھا سینہ بھی

کیا دن تھے کہ آقا سے تھوڑی سی ہی دوری پر
بیداری بھی، سونا بھی، کھانا بھی تھا، پینا بھی

اک نسخۂ نادر ہے یہ بہرِ دلِ مضطر
پڑھتے ہی درود اُنؐ پر حاصل ہو سکینہ بھی

عطروں میں ملاتے تھے اصحابِ نبیؐ جس کو
بہتر تھا گلابوں سے آقاؐ کا پسینا بھی

آقا کی اطاعت ہی کام آئے گی محشر میں
جب کام نہ آئے گا شاہوں کا خزینہ بھی

احوال صحابہ کے جانو، تو سمجھ لوگے
کہتے ہیں کسے مرنا، کیا چیز ہے جینا بھی

ہیں سارے سوار اس کے، ملّاح بھی اس کا ہے
اللہ کا سب کچھ ہے، دریا بھی، سفینہ بھی

دن جس نے گزارے ہوں سنت سے بغاوت میں
کیا آئیں گے کام اس کے اورادِ شبینہ بھی

نعتوں میں نہ لکھو، یہ الفاظ، سخن سازو!
ناپاک ہیں سب بادہ، پیمانہ و مینا بھی

رہتا ہے ہمیشہ جو بس حق کی حمایت میں
مرنا بھی رئیس اس کا، ہے اس کا ہی جینا بھی

رسید کتب موصولہ

حسن ضیاء، اردو صحافت اور ادب (اداریے اور شذرات): پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات: ۳۸۴، سال اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ، بیان شبلی (۷) : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۵۰روپے، ای میل: info@ephbooks.com

جہانگیر انس، تین ستارہ منزل: عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ، صفحات: ۱۲۸، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۳۳۰۵۰۶۳۴

مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، حرمین شریفین: تاریخ اور فضائل: کمال بک ڈپو، مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، مئو، صفحات: ۳۵۲، سال اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

مولانا ابن الحسن قاسمی، حیاتِ پھولپوریؒ: مصطفیٰ لائبریری، مہراج گنج (یوپی)، صفحات: ۴۰۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۵۸۶۵۰۰۱

محمد سلمان بجنوری ندوی، خطباتِ محمود، مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، صفحات: ۴۰۰، سال اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۴۰۰روپے، موبائل نمبر ۹۳۳۵۹۸۲۴۱۳

سید انوار صفی، سنگِ زر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، صفحات: ۱۶۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی، ڈاکٹر فائزہ عباسی (پیش کش)، قرآن مجید ترجمہ بزبان اردو: براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۵۸۴، سال اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت: ۴۹۹، موبائل نمبر: ۷۰۸۸۸۸۴۴۶۸

شاہد ندیم، کتابیں: کتاب دار، ممبئی، صفحات: ۱۷۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۲۴۵۲۵۳۱۷

شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا تجمل حسین بہاری (مرتب)، کمالات رحمانی: دارالاشاعت خانقاہ رحمانی، مونگیر (بہار)، صفحات: ۱۹۲، سالِ اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۱۰۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

OCT 2025 Vol- 212(10) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay PhonePe paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان (ڈائرکٹر)